شاہینِ ملّت

(ایئر مارشل محمد اصغر خاں)

شاہینِ ملت

(ائیر مارشل محمد اصغر خاں)

تالیف: احمد شائق

مکتبۂ احباب لاہور
کبیر اسٹریٹ اردو بازار

اشاعت اول ——— فروری ۱۹۶۹ء

ناشر ——— نور علی شاہ مکتبہ احباب لاہور

طابع ——— پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور

قیمت ——— سفید کاغذ تین روپے پچاس پیسے

اخباری کاغذ دو روپے پچھتر پیسے

کتابت: محرّم علی خاں غالب رقم

ائیر مارشل محمدؐ اصغر خاں

ھر زباں پر ہے آج تیرا نام
تُو نے سمجھے ہیں قوم کے آلام
تیری آمد سے ہر کوئی مسرُور
مرحبا! اے مجاہدِ اسلام

(احمد شائق)

مندرجات،

انٹرویو:

مقالات:

اور

○

"سچی بات"

پاکستانی فضائیہ کے معمارِ اوّل، شاہینِ ملت ـــ ائیر مارشل محمد اصغر خان نے میدانِ سیاست میں قدم رکھ کر اپنی زندگی کے ایک نئے سفر کا آغاز کیا ہے۔ آپ ایک جانی پہچانی اور معروف شخصیت ہیں۔ پاکستان کا بچہ بچہ آپ کے نام سے آشنا ہے۔ آپ کی تربیت کردہ پاکستانی ایئر فورس کے جانباز شاہینوں نے ستمبر ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں جو کارنامہ انجام دیا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ موجودہ حالات میں آپ کا میدانِ سیاست میں اُترنا جمہوریت پسند اور اسلام دوست طبقات کے لئے باعثِ مسرت ہے۔ سیاست میں آنے سے پہلے ائیر مارشل صاحب نے ملکی حالات پر کچھ مضامین لکھنا شروع کئے جو مختلف اخبارات میں اشاعت پذیر ہوتے رہے۔ آپ نے اپنے ان مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان سے آپ کی ذہنی اپج اور طبعِ حساس کا پتا چلتا ہے اور جو حقائق بیان کئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نہ صرف یہ کہ نظریۂ پاکستان پر کامل یقین رکھتے ہیں بلکہ نظریۂ پاکستان کے تحفظ اور دفاع کو بھی لازم قرار دیتے ہیں۔ آپ کے الفاظ میں "پاکستان صرف اور صرف اسلام کے لئے معرضِ وجود

میں آیا ہے۔" یہ ہر پاکستانی کے دل کی آواز ہے۔ وہ کلمہ آج تک لوگوں کی زبانوں پر موجود ہے جو تحریک پاکستان کا "سلوگن" تھا۔ یعنی "پاکستان کا مطلب کیا؟ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ" یہ کلمہ پاکستان اور نظریۂ پاکستان کی اساس ہے۔ اور یہی وہ کلمہ ہے جس کے لئے لاکھوں بندگانِ خدا نے اپنے گھربار اور عیش و آرام کو تج کر پاکستان کے وجود کو ممکن بنایا۔ ان میں وہ مسلمان بھی شامل تھے جنھیں معلوم تھا کہ وہ جن علاقوں میں رہتے ہیں وہ اصولِ تقسیم کے لحاظ سے پاکستان کے حصے میں نہیں آئیں گے۔ اگر نظریۂ پاکستان کی بنیاد محض "معاش" ہوتی تو ان علاقوں کے مسلمانوں کو اپنا مستقبل تباہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔؟ ان اللہ کے بندوں نے قربانیاں دیں تو صرف اس لئے کہ اس زمین پر مسلمانوں کا ایک ایسا ملک وجود میں آجائے جس میں کلمۂ طیبہ کی اساس پر اسلامی معاشرے کا قیام ممکن ہو۔

شاہین ملت ائیر مارشل محمد اصغر خاں نے اپنی ایک تقریر میں یہ بھی فرمایا ہے کہ "میں کسی "ازم" کا قائل نہیں ہوں۔ میں صرف پاکستانی "ازم" کا قائل ہوں۔ اور اسلام پر ایمان رکھتا ہوں"۔ آپ کو یہ وضاحت شاید اس لئے کرنی پڑی کہ پاکستان میں ایک گروہ ایسا بھی پیدا ہوگیا ہے جو نظریۂ پاکستان کی بجائے کمیونزم اور سوشلزم

پر ایمان رکھتا ہے — یہ گروہ ملک پر مسلط ایک آمرانہ نظام کی جگہ دوسرا آمرانہ نظام لانا چاہتا ہے اور پاکستان میں سرمایہ دارانہ طرز کی آمریت کی جگہ سوشلسٹ طرز کی آمریت کے قیام کے لئے مصروفِ عمل ہے جبکہ آمریت خواہ سرمایہ دارانہ طرز کی ہو یا سوشلسٹ طرز کی، عالمِ اسلام کے لئے بلکہ پوری انسانیت کے لئے باعثِ ذلّت ثابت ہوئی ہے۔ ان ہر دو قسم کی آمریتوں نے دنیائے اسلام میں انتشار و ذہنی پراگندگی کے بیج بو کر مسلمانوں کی اجتماعی قوت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔ سوشلزم یا اسلامی سوشلزم کے نام پر عالمِ عرب میں جیسی آمریتیں قائم ہیں وہ ہمارے سامنے ہیں۔ اور ان سے جو کچھ مسلمانوں کو ملا ہے اور جس طرح کے نتائج برآمد ہوئے وہ بھی ہم دیکھ چکے ہیں۔ نظریہ پاکستان سے منحرف اس گروہ میں زیادہ تر وہ لوگ ہیں جو بڑی بڑی جاگیروں کے مالک ہیں اور قلعہ نما محلات میں رہتے ہیں۔ جن کا کردار ابن الوقتی ہے اور جو ہر چڑھتے سورج کی پرستش کے فلسفے کے امین ہیں۔ یہ لوگ ہمیشہ غریب کسانوں اور فاقہ مست لوگوں کے نحیف کاندھوں کو اپنی پوجی شخصیات کی بلندی کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ ان کے "دانشور" علامہ اقبالؒ کے ایک فقرے اور قائدِ اعظمؒ کے ایک جملے سے پاکستان میں "سوشلزم" کے قیام کا جواز پیدا کرتے ہیں۔ حالانکہ قائدِ اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی بیشتر تقاریر پاکستان

میں خالص اسلامی معاشرے کے قیام کا پہلو اجاگر کرتی ہیں اور علامہ اقبال مرحوم جیسے مردِ مومن کی فکر کا محور ہی صرف اسلام ہے بھلا کون ایسا شخص ہے جو اس حقیقت کو نہیں جانتا کہ علامہ اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ کے فکر و نظر اور جذبات و احساسات کا مرکز واشنگٹن، لندن، پیکنگ یا ماسکو نہیں تھا بلکہ آپ کے فکر و نظر کا مرکز خدا کے آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات و احکامات تھے۔ وہ شخص علامہ اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ کی روح پر سخت ظلم ڈھاتا ہے جو ان کے افکار کے ڈانڈے اسلام سے کاٹ کر سوشلزم سے جوڑتا ہے یا ان کے بعض فقروں کے مفہوم کو الجھا کر انھیں بیرونی نظریات کا غلام ظاہر کرتا ہے ——————

علامہ اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ نے کبھی کسی مادہ پرست یہودی یا عیسائی مفکر کو اپنا ہیرو اور راہنما تسلیم نہیں کیا۔ انھوں نے اگر کہیں کسی ابھرتی ہوئی قوم کے بعض اوصاف کی تعریف کی ہے تو صرف اس لئے کہ سوئی ہوئی ملّتِ اسلامیہ کو جگائیں۔ اور مسلمانوں کو یہ احساس دلائیں کہ راہ اعتدال سے بھٹکی ہوئی قومیں تو افراط و تفریط کے ملغوبے لئے آگے بڑھ رہی ہیں اور تم ہو کہ ایک نظامِ عدل رکھتے ہوئے بھی پیچھے ہو

بہرکیف ائیر مارشل محمد اصغر خاں نے اپنی تقاریر میں اب تک جو کچھ قوم کے سامنے پیش کیا ہے وہ قابلِ تحسین ہے اور انھوں نے جو راہ

اعتدال اپنائی ہے اس سے اُمید بندھتی ہے کہ پاکستان میں نظریۂ پاکستان کے فروغ اور جمہوریت کے نشو و نما کے دور کا انشاء اللہ جلد از جلد آغاز ہو گا۔

شاہینِ ملت ایئر مارشل محمد اصغر خاں نے جس انداز سے میدانِ سیاست میں قدم رکھا ہے اس سے جمہوریت کے طالب عوام میں حرکت و عمل کی رُوح دوڑ گئی ہے۔ اپوزیشن پارٹیاں پورے جوش و خروش اور عزم و یقین کے ساتھ میدان میں نکل آئی ہیں۔ جمہوریت پسند طبقوں کی دس سالہ جدّ و جہد رنگ لا رہی ہے اور وہ طلسم ٹوٹ رہا ہے جس نے ذہنوں کو ماؤف اور دلوں کو بے حس بنا دیا تھا۔ آپ نے بحالیٔ جمہوریت کی آواز میں آواز ملا کر قوم کے دل جیت لئے ہیں۔ اور قافلۂ جمہوریت کو اس کی منزل کے قریب لا کھڑا کیا ہے۔ آپ کے اب تک کے طرزِ عمل اور بیانات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ نہ اقتدار کے بھوکے ہیں اور نہ قیادت کے طالب — اور وہ لوگ جھوٹے ہیں جو آپ پر ہوسِ اقتدار کا الزام لگا رہے ہیں۔ اگرچہ اقتدار کا چاہنا بذاتِ خود قطعاً معیوب نہیں۔ درحقیقت ایئر مارشل محمد اصغر خاں کا مقصد قوم کو اس کا وہ حق واپس دلانا ہے جو چند لوگوں نے غصب کر لیا ہے۔ آپ کی پکار اتحاد و اتفاق کی پکار ہے آپ کا پیغام حرکت و عمل کا پیغام ہے۔ اور ہم آپ کے اس پیغام اور آپ کی اس پکار کو آئندہ صفحات میں پیش کرنے کی جرأت کر رہے ہیں۔ یہ صفحات آپ کی مختلف تقریریں،

مضامین، انٹرویو اور ملکی اخبارات و رسائل کے تاثرات پر مشتمل ہیں۔ اگر ان کی ترتیب و تدوین میں کوئی خوبی ہے تو وہ صرف ایئر مارشل محمد اصغر خان کی محبت اور خدا کے فضل و کرم کا نتیجہ ہے۔ اور اگر کوئی کمی رہ گئی ہے تو میں اس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ خدا کرے قوم کے جذبات و احساسات، امیدوں اور آرزوؤں کے مرکز، شاہین ملت ایئر مارشل محمد اصغر خان قافلۂ جمہوریت کی فتح کا باعث ہوں۔ اور وہ صبح طلوع ہو جس کے انتظار میں جمہور کی آنکھیں دس سال سے سلگ رہی ہیں۔ اور جس کے لئے سینکڑوں فرزندانِ ملت نے اپنا گرم خون چھڑک کر امید کے چراغ روشن کئے ہیں۔

احمد شائق - لاہور

۲۶ رمضان المبارک - ۱۳۸۸ھ

منظر و پس منظر

(سوانحی خاکہ)

"حسیب ان کے متعلق کیا بتاؤں، بس عام سے انسان ہیں . . . . . گھر کے معاملات میں دلچسپی لیتے ہیں، اور بچوں کی تربیت کا خاص خیال رکھتے ہیں . . . . کبھی بلند آواز سے نہیں بولتے۔ غصہ کم آتا ہے . . . اُنھوں نے مجھے کسی مرحلے پر بھی بڑے آدمی کی بیوی ہونے کا احساس نہیں ہونے دیا۔ بچوں کو بھی آرام و آسائش کا خوگر ہونے سے بچایا۔"

(بیگم اصغر خاں)

○

"وہ با اصول، باضمیر، صابر اور بُردبار سبھی کچھ ہیں۔ مگر ان کی یہ بات سب سے زیادہ پسندیدہ ہے کہ اُنھیں اپنے جسم اور روح پر پورا پورا اختیار حاصل ہے۔"

(ایک افسر)

شاہینِ ملّت ائیر مارشل محمد اصغر خاں کی عمر اس وقت تقریباً ۴۷ سال ہے۔ آپ ۱۷ جنوری ۱۹۲۱ء کو کشمیر میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد بزرگوار جناب رحمت اللہ خاں کشمیری فوج میں بریگیڈیئر تھے۔ یہ بزرگ پرانی وضع کے امین اور صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے۔ آپ کی والدہ محترمہ بھی نہایت سادہ اور پُر وقار زندگی کی مالک تھیں۔ گھر کا ماحول پاکیزہ اور دین دارانہ تھا جس کے اثرات آج بھی شاہینِ ملّت کی زندگی میں پائے جاتے ہیں۔ شاہینِ ملّت ائیر مارشل محمد اصغر خاں نے ابتدائی تعلیم پرنس ویلز ملٹری کالج ڈیرہ دون میں حاصل کی اور پھر ۱۹۴۰ء میں انڈین ملٹری اکیڈمی سے گریجویٹ ہوئے۔ آرمی میں کمیشن ملا اور کمیشن پانے کے بعد آپ انڈین ائیر فورس میں چلے گئے۔

دوسری جنگِ عظیم میں آپ اراکان فائٹر سکویڈرن میں رہے اس کے بعد بحیثیت انسٹرکٹر کی حیثیت سے انبالہ آ گئے۔ آپ امپیریل ڈیفنس کالج لندن، دی فائٹر لیڈرز سکول ائیر سٹاف کالج اور جائنٹ سروسز سٹاف کالج کے گریجویٹ بھی ہیں۔

پاکستان قائم ہونے کے فوراً بعد آپ کو پاکستان ایئر فورس کالج کا پہلا کمانڈنٹ مقرر کیا گیا. ۱۹۴۹ء میں گروپ کمانڈر کا منصب ملا. اسی طرح مختلف مراحل طے کرنے کے بعد جولائی ۱۹۵۷ء میں آپ پاکستان ایئر فورس کے کمانڈر انچیف بنائے گئے. اُس وقت ایئر مارشل محمد اصغر خاں دنیا کے سب سے کم عمر کمانڈر انچیف تھے. آپ نے اس عظیم منصب پر فائز ہو کر ملک و ملت کی جو خدمت انجام دی ہے وہ کسی سے مخفی نہیں. آپ نے پاکستان ایئر فورس کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے کی کوشش کی. انتہائی جانفشانی اور محنت سے اس کی تنظیم کی. آپ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس عظیم عہدے پر فائز رہنے کے خواہشمند نہیں تھے. اس لئے بیسیوں اپنے جانشین پیدا کئے جن میں ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر صلاحیتوں کا مالک ہے اور ملک و ملت کی خدمت کے جذبے سے سرشار ہے. آپ نے پاک فضائیہ کے جانباز شاہینوں کی تنظیم و تربیت کر کے اُنھیں اس قابل بنایا کہ آئندہ آنے والی ذمہ داریوں کو احسن طریقے سے نباہ سکیں. ستمبر ۱۹۶۵ء کی پاکستان اور بھارت کی جنگ میں ان شاہینوں نے جو کارنامے انجام دیئے ہیں اور جس جرأت و جوانمردی سے مملکت خداداد پاکستان کی حفاظت کی ہے وہ ایئر مارشل محمد اصغر خاں کی کی ہوئی تربیت و تنظیم کی ایک کھلی ہوئی دلیل ہے. آپ کو شروع سے اس بات کا پوری طرح احساس تھا کہ بھارت جو پاکستان

کا سب سے بڑا حریف ہے اور کئی گنا زیادہ طاقت کا مالک ہے ایک نہ ایک دن ضرور حملہ آور ہوگا۔ اور جنگ ہوئی تو نہایت شدید ہوگی۔ اس لئے آپ نے اپنے حسنِ تدبیر سے ان خطرات کی پیش بندی کی۔ اور ائیر فورس کے جوانوں کو ان متوقع خطرات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار کیا۔ ذرائع و وسائل کی کمی جاں نثاری و فداکاری کے اوصاف ابھار کر پوری کی۔

شاہینِ ملت ائیر مارشل محمد اصغر خاں نے جن اصولوں پر پاکستان ائیر فورس کے جوانوں کی تربیت کی ان میں پہلا اصول جذبۂ خود اعتمادی کا نشوونما تھا۔ مشکل کام پہلے خود کرتے پھر کسی دوسرے کو اس کے کرنے کا حکم دیتے۔ خطرناک مہمات کے لئے اپنی ذات کو آگے لاتے۔ کبھی کسی جوان کو احساسِ کمتری میں مبتلا نہ ہونے دیتے۔ ہر موقع پر ان کے حوصلے بڑھاتے اور انھیں اپنے آپ پر اعتماد کرنے کی تلقین کرتے۔

جولائی ۱۹۵۷ء سے لے کر جولائی ۱۹۶۵ء تک آپ نے اس عظیم محاذ پر ملت اسلامیہ کی عظیم الشان خدمت انجام دی۔ اس کے بعد آپ کو پی۔ آئی۔ اے کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ ائیر فورس سے ریٹائر ہونے کے بعد آپ کی خواہش تھی کہ اپنے بال بچوں میں وقت گزاریں اور ان کی تعلیم و تربیت کیلئے وقف ہو جائیں مگر سربراہِ مملکت نے آپ کو مجبور کیا کہ آپ اپنے تجربات سے پی۔ آئی۔ اے کی تعمیر و ترقی میں اضافہ کریں۔ آپ نے یہاں بھی اپنی

ذمہ داریوں کو پوری طرح نبھایا۔ مگر آپ کی طبیعت۔ جیسا کہ آپ نے اپنی ایک تقریر میں کہا ہے۔۔ ملازمت سے بھر چکی تھی۔ آپ نے مستقل چھٹی کے لئے دو درخواستیں صدرِ مملکت کی خدمت میں پیش کیں۔ جنھیں نامنظور کیا گیا۔ پھر تیسری درخواست پر آپ کو فارغ کر دیا گیا۔ ملازمت سے فراغت پا کر آپ نے چاہا کہ اپنی باقیماندہ زندگی کے شب و روز اپنے بال بچوں میں آرام سے گزاریں۔ مگر ؎

وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے

کے مصداق ایسا نہ ہو سکا۔ وطنِ عزیز پاکستان کے اندرونی حالات نے آپ کو اپنا ارادہ بدلنے پر مجبور کیا۔ ملک کے بارہ کروڑ باشندوں کی بحالیٔ جمہوریت کی پکار نے آپ کو ایبٹ آباد کی پرسکون و راحت خیز فضا سے نکال کر میدانِ سیاست کی ہنگامہ خیز فضا میں لا کھڑا کیا۔

۱۷ نومبر ۱۹۶۸ء کے دن سے آپ کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے۔ اس روز آپ نے صوبائی دارالحکومت لاہور کے ایک ہوٹل میں پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے سیاست میں حصہ لینے کا اعلان کیا۔ اور پھر مغربی و مشرقی پاکستان کے مختلف شہروں میں عوامی اجتماعات بار ایسوسی ایشنوں اور سیاسی تنظیموں کے کارکنوں سے خطابات کا سلسلہ شروع کیا۔ آپ نے اپنے ان خطابوں میں باشندگانِ ملک کے احساسات

اور جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے تحریک بحالیٔ جمہوریت کی جدّوجہد میں زندگی کی رَو دوڑا دی۔

شاہینِ ملّت زندہ باد

اسلام زندہ باد

عوام زندہ باد

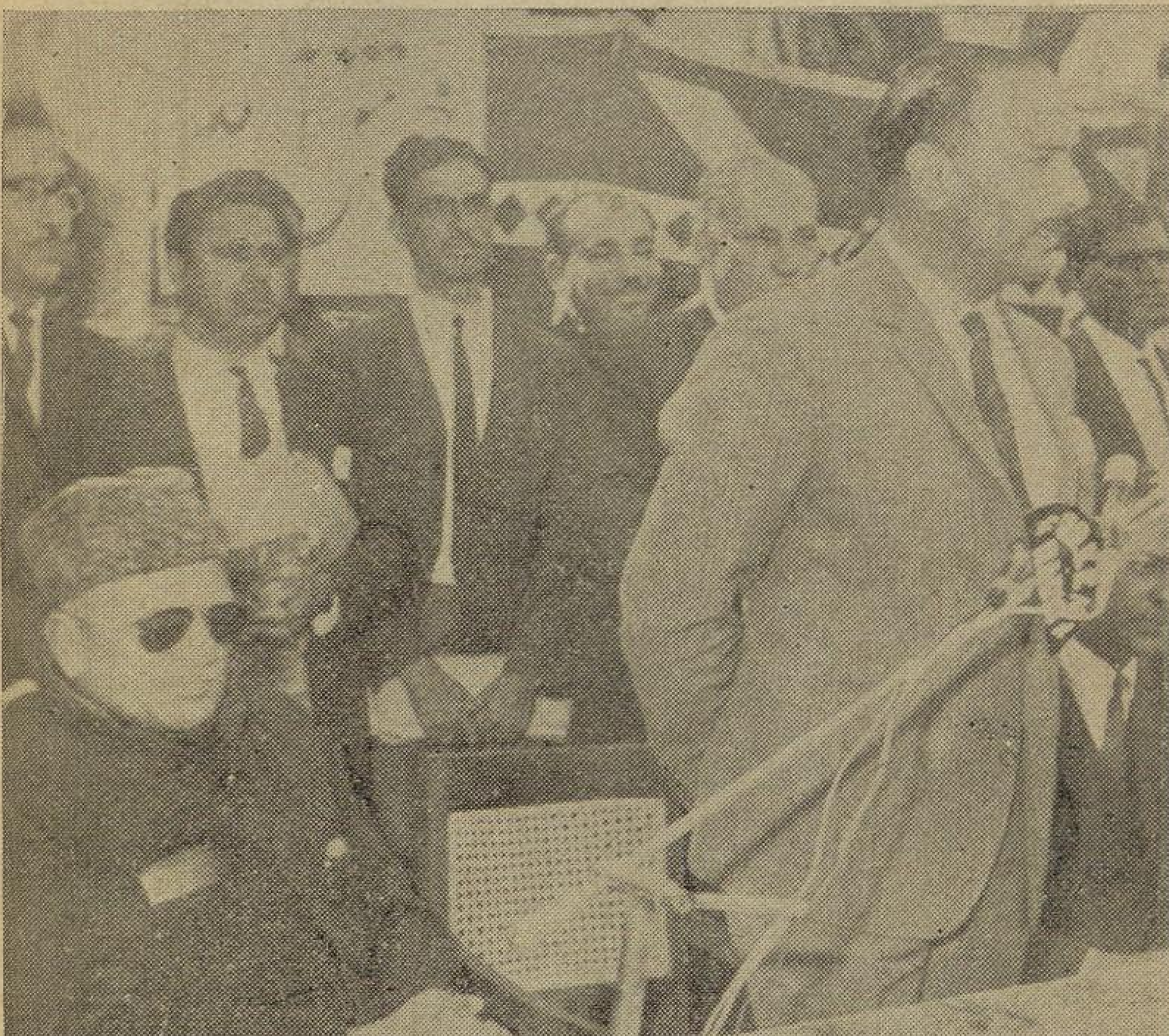
ایئر مارشل

میدان سیاست میں

"میرا یہ عقیدہ ہے کہ کسی مملکت کی ارضی سرحدوں کی حفاظت اُس وقت تک بے معنی ہے جب تک اس کی مذہبی اور نظریاتی سرحدوں کی حفاظت نہ کی جائے میں اسی مقصد کے لئے اُٹھا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ اس مقصد میں ہمیں کامیابی ہوگی۔"



" شاهین مات "، راولپنڈی میں بار کونسل



سے خطاب فرما رہے ہیں۔

"میں سمجھتا ہوں پاکستانی عوام دوسری قوموں کے مقابلے میں زیادہ سیاسی شعور سے بہرہ ور ہیں۔ اُن کا سب سے بڑا کارنامہ خود یہ پاکستان ہے۔ پاکستان اُنھوں نے براہ راست ووٹوں کے ذریعے حاصل کیا ہے اور یہ قائم و دائم بھی اُسی وقت رہ سکتا ہے جب انہی کی مرضی یہاں فیصلہ کُن قوت ہو۔ کوئی ایک شخص یا ایک گروہ اپنی من مانی نہ کرنے پائے۔"

۲۷ تا ۴۹

آنے والے صفحات درج ذیل مقامات کی تقاریر اور بیانات پر مشتمل ہیں

نومبر ۶۸ء	لاہور	پہلی پریس کانفرنس	۲۳ دسمبر ۶۸ء	لائلپور	اجتماع تحریک جمہوریت
۱۹	″	ہائیکورٹ بار ایسوسی ایشن	۴ ″	سرگودھا	″ ″
۲۰	″	پریس انٹرویو	۵ ″	″	جلسہ عام
۲۲ ″	راولپنڈی	ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن	۷ ″	سیالکوٹ	بار ایسوسی ایشن
۱۳ ″	ایبٹ آباد	″ ″	۹ ″	لاہور	″ ″ ″
۲۲ ″	پشاور	سٹی مسلم لیگ اجتماع	۱۱ ″	ڈھاکہ	″ ″ ″
″	″	ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن	۱۴ ″	سلہٹ	″ ″ ″
۲۸ ″	مردان	″ ″	۱۵ ″	ڈھاکہ	اجتماع تحریک جمہوریت
۳۰	جہلم	″ ″	۱۸ ″	″	ہائیکورٹ بار ایسوسی ایشن
یکم دسمبر ۶۸ء	لاہور	″ ″	۱۹ ″	چٹاگانگ	ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن
۲ ″	ملتان	″ ″	۲۴ ″	لاہور	پیغام یوم قائد اعظمؒ

- مَیں کسی "ازم" کا قائل نہیں ہوں۔ میں صرف "پاکستان ازم" کا قائل ہوں اور وہ صرف اسلام ہے۔
- پاکستان کسی ایک شخص یا ایک گروہ کی جاگیر نہیں ہے یہ بارہ کروڑ عوام کا وطن ہے۔
- ایک متحد و منظم قوم کو دنیا کی کوئی طاقت نہیں دبا سکتی۔
- اکتوبر ۵۸ء کے انقلاب سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا۔
- عوام متحد ہو جائیں۔ اب ان کی منزل بہت قریب ہے۔
- میں اقتدار حاصل کرنے کیلئے نہیں بلکہ ایسے حالات پیدا کرنے کے لئے نکلا ہوں جو سیاسی جماعتوں کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔

"تحریکِ جمہوریت" نے انتخابات کے بائیکاٹ کا جو فیصلہ کیا ہے وہ صحیح ہے۔ گو میں تحریکِ جمہوریت کا رُکن نہیں ہوں مگر اخلاقی طور پر اس کے فیصلے کا پابند ہوں۔"

پہلی پریس کانفرنس

میں کچھ عرصہ سے ملک کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی حالات میں انحطاط کا مطالعہ کرتا رہا ہوں۔ رشوت ستانی و بدعنوانی، اقربا نوازی، سیاسی بداعمالی اور انتظامی نااہلی ہمارے لاکھوں اہلِ وطن کی زندگیوں کو متاثر کر رہی ہے، سماجی عدم مساوات اور اقتصادی تفاوت فزوں تر ہے۔ امیر اور غریب کے درمیان بُعد بڑھتا جا رہا ہے۔ ان حالات کا نتیجہ یہ ہے کہ عوام کی ایک بہت بڑی اکثریت کا یہ اعتماد ختم ہو گیا ہے کہ حکومت اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی اہل ہے۔ لہٰذا ضبط و قانون سے متعلقہ صورتِ حال لامحالہ متاثر ہوئی ہے۔ ہمارے تعلیمی اداروں کی موجودہ ابتر صورتِ حال، ہمارے نوجوانوں اور ملک کے مستقبل پر بُری طرح اثر انداز ہو رہی ہے۔ آزادئ تحریر و تقریر کو اس انداز سے دبایا گیا ہے کہ رائے عامہ کا اظہار بہت مشکل ہو گیا ہے۔ حالات اس حد تک ابتر ہو چکے ہیں کہ حکومت محض طاقت کے ذریعے خود کو سنبھالے ہوئے ہے۔ کسی بھی جمہوری ملک میں ایسے حالات میں حکومت کیلئے لازم ہوتا ہے کہ وہ ایسے لوگوں کے لئے جگہ خالی کر دے جو عوام کا اعتماد بحال کر سکیں۔ بہرکیف ہماری موجودہ حکومت کی ہیئت اور فلسفہ ایسا ہے کہ اس امر کا امکان نہیں۔ ان حالات میں عوام

کے لئے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ وہ منظّم و مربوط انداز سے اظہارِ رائے کا حق بروئے کار لائیں اور ظلم و استبداد کے خلاف جدّوجہد کے لیئے یہ ضروری ہے کہ تمام بہی خواہ متحد ہو کر ایک آزاد اور ترقی پذیر معاشرے کی تعمیر کے لئے کام کریں۔

انتہائی غور و خوض اور احتیاط کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر ہم نے اس عظیم مقصد کے لئے اپنا کردار سر انجام نہ دیا خواہ وہ کتنا ہی اُدنیٰ او عاجزانہ کیوں نہ ہو، تو پاکستان کے ایک شہری کی حیثیت سے اپنا فریضہ انجام دینے میں ناکام متصوّر ہوں گے لہٰذا میں نے ملک کو درپیش مسائل کے حل کے لئے رائے عامہ کو متحد کر کے متعیّن راہ پر چلانے کا فیصلہ کیا ہے۔ میں تمام محبِّ وطن پاکستانیوں سے اپیل کروں گا کہ وہ متّحد و منظّم ہو کر ان اقدار کی بحالی کے لئے کام کریں جن کی خاطر پاکستان معرضِ وجود میں آیا تھا۔ اور جنھیں مسلسل نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ سرِدست میں کسی سیاسی جماعت سے وابستہ ہونے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ میں ملک میں ایسے حالات پیدا کرنا چاہتا ہوں جن کے تحت سیاسی جماعتیں آزادی کے ساتھ کام کر سکیں۔ ایسے حالات کے بغیر کسی جماعت سے وابستگی بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ میں اس بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ کسی سیاسی جماعت میں شرکت کے بغیر پُرامن اور آئینی طریق پر کوئی تبدیلی لانا ممکن نہیں ہوتا۔

بہرکیف میں ہم خیال لوگوں سے بات چیت کرنے کے بعد کسی ایسی پارٹی کو پسند کروں گا جو میرے ان نظریات کے معیار پر جن کا ذکر میں نے اپنے تحریری بیان میں کیا ہے، پوری اُترتی ہو گی۔ لیکن بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ اس ملک میں سیاسی جماعتوں کے لئے آزادی سے سرگرم عمل ہونے کے لئے سازگار فضا موجود نہیں۔ میں نے کافی سوچ سمجھ کر عملی سیاست میں آنے کا فیصلہ کیا ہے اور اس فیصلے کے نتائج خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہوں، میں ہر قربانی دینے کے لئے تیار ہوں۔ میں طرزِ حکومت کے بارے میں کسی "اِزم" کا قائل نہیں ہوں۔ یہاں صرف "پاکستان ازم" ہونا چاہئے — سیاسی جماعتوں کو متحد ہو کر ملک و قوم کی خدمت کرنی چاہئے اور غیر ذمہ دار افراد کو آگے آنے سے روکنا چاہئے۔ جن سے ملک کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا +

مَیں سیاست میں کیوں آیا ؟

مَیں نے ۲۵ — ۳۰ برس تک فوج کی نوکری کی ہے اور میرا ماضی بالکل غیر سیاسی رہا ہے۔ میری کوشش ہمیشہ یہی رہی ہے کہ ملک کی فضائیہ کو اس اعلیٰ معیار پہ لے جاؤں کہ وہ دشمن کے دانت کھٹے کر سکے۔ کیونکہ میرا دل کہتا تھا کہ ہمارا دشمن سے مقابلہ ہوگا اور سخت مقابلہ ہوگا۔ نوکری پوری کر لینے پر میں نے چھٹی کی درخواست دی۔ صدر صاحب نے درخواست تو منظور کر لی مگر کہا کہ پی۔ آئی۔ اے کی سربراہی قبول کر لوں کیونکہ اس ادارے کو میرے تجربات سے فائدہ ملنا چاہیئے۔ پی۔ آئی۔ اے کی نوکری کے دوران میں۔ نے یہ محسوس کیا کہ میں یہاں کام نہ کر سکوں گا۔ لیکن مجھے چھٹی نہ مل سکی۔ بالآخر نوکری کی میعاد ختم ہونے سے پہلے ہی میں علیحدہ ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ ایبٹ آباد میں قیام کے دوران مجھے عام لوگوں سے ملنے کا موقع ملا۔ اور پھر میں نے حالات کا جائزہ لے کر سلسلہ مضامین شروع کیا۔ جب سیاسی لیڈروں کی گرفتاریاں شروع ہوئیں اور حالات بگڑے تو میں نہ رہ سکا اور میں نے دوسرے اپوزیشن لیڈروں کی آواز میں اپنی آواز کو شامل کر دیا۔ میری خواہش یہ ہے کہ میں قوم کو اس نصب العین کے قریب لے جاؤں جو قائدِ اعظمؒ کے سامنے تھا۔ قوم کی خدمت کے سوا میرے پیش نظر اور کچھ نہیں

ہے۔ مجھے بادلِ ناخواستہ سیاست میں حصّہ لینا پڑا ہے۔ مجھے دوستوں نے مشورہ دیا تھا کہ میں سیاست کے گندے کاروبار سے دُور رہوں لیکن وقت آگیا ہے کہ ستھرے ماضی کے حامل لوگ آگے آئیں۔ میں اقتدار کا خواہاں نہیں ہوں۔ میری تربیت، مزاج اور پسِ منظر اس میدان کے لیے موزوں نہیں ہے۔ لیکن کافی عرصہ سے وطنِ عزیز کے حالات کا بڑی دردمندی سے جائزہ لیتا رہا ہوں۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوا تھا کہ پاکستان جن مقاصد اور اقدار کے لئے حاصل کیا گیا تھا انھیں یکسر نظر انداز کر دیا گیا۔ یہ بات سخت باعثِ تشویش ہے کہ نئی نسل ایسے ماحول اور فضا میں پروان چڑھ رہی ہے جو قیامِ پاکستان کے اصل منشا کے منافی ہے اور جھوٹ و منافقت سے پُر ہے۔ مجھ سے سوال کیا جاتا ہے کہ میں کیوں کسی سیاسی جماعت میں شامل نہیں ہو جاتا۔ اصولی طور پر سیاسی جماعتیں اقتدار حاصل کرنے کے لئے بنائی جاتی ہیں جبکہ میں اقتدار حاصل کرنے کے لئے نہیں بلکہ ملک میں ایسے حالات پیدا کرنے کے لئے نکلا ہوں جو سیاسی جماعتوں کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ میرا مقصد یہ ہے کہ عوام کو متحد و منظم کیا جائے تاکہ وہ اپنے حقوق کے لئے صحت مند فضا میں جدوجہد کر سکیں۔

عوام کی منزل اب بہت قریب ہے

میں نے ملازمت کے بعد جب یہ محسوس کیا کہ حکومت نے ایسے حالات پیدا کر دیئے ہیں کہ اس کو تبدیل کرنا اب ضروری ہو گیا ہے تو میں نے اپنی اس مہم کا آغاز کیا۔ مجھے لیڈری کی ہرگز خواہش نہیں ہے۔ مجھے صرف ملک و قوم کی خدمت کا جذبہ عوام تک لے آیا ہے۔ اگر عوام اور اپوزیشن جماعتوں نے موجودہ جوش و خروش، اتحاد و تنظیم کا مظاہرہ جاری رکھا تو موجودہ حکومت کی جگہ ایک ایسی حکومت قائم کرنے کا مقصد حاصل ہو جائے گا جو ملکی مسائل کو دیانت داری سے حل کر سکے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایک متحد و منظم قوم کو دنیا کی کوئی طاقت نہیں دبا سکتی۔ اپوزیشن جماعتوں کو متحد و منظم ہو جانا چاہیئے۔ ان کے اتحاد کے بغیر موجودہ حکومت کو راہِ راست پر نہیں لایا جا سکتا۔ ملک میں بنیادی حقوق کے مطالبے کی جو تحریک شروع ہوئی ہے، اسے صحیح بنیاد پر چلانے کی ضرورت ہے تاکہ پاکستان کو قائدِ اعظمؒ کے اصول اور نظریات کے مطابق بنایا جا سکے۔ ہمارا سب سے بڑا فرض حکومت کو اس حقیقت کا احساس دلانا ہے کہ یہاں صرف عوام کی منشا اور مرضی کے مطابق ہی حکومت چل سکتی ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ بے لوث اور دیانتدار لوگ آگے آئیں اور اس تحریک کو کامیابی سے ہمکنار کریں۔ میرا یقین ہے کہ

اپوزیشن جماعتیں بالآخر موجودہ حکومت کو بدلنے میں کامیاب ہو جائیں گی۔ عوام کو بھی چاہیئے کہ وہ متحد ہو جائیں۔ اب ان کی منزل بہت قریب ہے۔ اگر انھوں نے یہ موقع کھو دیا تو انھیں مزید دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ میں نے اپنے دورے سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ پاکستان کے عوام شیر دل ہیں۔ مجھے قوی امید ہے کہ عوام کے تعاون سے جمہوریت کا قافلہ بہت جلد منزل مقصود پر پہنچ جائے گا۔ میں قوم کے مستقبل کے بارے میں مایوس نہیں ہوں۔ اور عوام کا سیاسی شعور اور ولولہ بڑا خوش آئند ہے۔

۵۸ء کے انقلاب سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا۔

مجھ سے پوچھا جاتا ہے کہ ۱۹۵۸ء کے فوجی انقلاب سے میرا کوئی تعلق تھا؟ میں اس وقت بے شک پاک فضائیہ کا کمانڈر انچیف تھا لیکن انقلاب سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ میں نے اکتوبر ۵۸ء کے انقلاب میں حصہ لیا تھا۔

میں کسی "ازم" کا قائل نہیں۔ غیر ملکی اخباری نمائندوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں کس "ازم" پر یقین رکھتا ہوں۔ میں نے انھیں جواب دیا کہ میں صرف "پاکستان ازم" کا قائل ہوں۔ یہ وہ "ازم" ہے جس پر پاکستان کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ اور جس کے بغیر پاکستان زندہ نہیں رہ سکتا۔ یہ "ازم" اسلام ہے۔ میں دائیں اور بائیں بازو کا قائل نہیں ہوں میں اسلام پر ایمان رکھتا ہوں۔ اسلام نے بنی نوع انسان کو جو آزادی اور حقوق دیئے

ہیں ان کو یہاں مسلسل نظر انداز کیا جا رہا ہے اور ان حقوق کی بحالی کے لئے نعرہ بازی کی بجائے منظم اور ٹھوس جدوجہد کی ضرورت ہے۔

ملک کے ابتر حالات ۔ اس وقت ملک داخلی انتشار و بدنظمی کا شکار ہے۔ پختونستان کا سٹنٹ، سندھ اور مشرقی پاکستان کے مسائل سامنے ہیں جن سے ہم سب لوگ بخوبی آگاہ ہیں۔ سرخپوش راہنما خان عبدالغفار خان کافی عرصہ سے کابل میں بیٹھے پختونستان کے سٹنٹ کو ہوا دے رہے ہیں۔ حالانکہ گزشتہ کچھ عرصہ سے انہوں نے کوئی نئی بات نہیں کہی ہے۔ لیکن سب سے زیادہ حیرت انگیز اور افسوسناک پہلو یہ ہے کہ ہمارے سرکاری اخبارات میں اس سٹنٹ کو بہت زیادہ اچھالا جا رہا ہے۔ اس سے میں نہیں سمجھ سکا کہ آیا اس قسم کے سٹنٹ کو اچھالنے کا مقصد عوام کی توجہ ملکی مسائل سے ہٹانا ہے یا کچھ اور؟ تاہم میرے نزدیک ایسے اقدامات کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ چند افراد کو ہر حالت میں برسر اقتدار رکھا جائے۔ یہ انتہائی افسوسناک ہے۔ یہ امر یقینی ہے کہ سابق صوبہ سرحد کے عوام سچے پاکستانی اور ملک و ملت کے وفادار ہیں۔ تخلیق پاکستان میں سرحد کے ان غیور عوام کا بہت بڑا حصہ ہے۔ یہ کتنی مضحکہ خیز بات ہے کہ اب ان سرحد کے غیور عوام پر اعتماد نہیں کیا جاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس علاقے کے لوگ بھی پاکستان کے دوسرے لوگوں کی طرح ہیں۔

اقتصادی بدحالی۔ ملک میں اقتصادی حالات مایوس کن ہوتے جا رہے ہیں۔ امیر بے حد امیر اور غریب روز بروز غریب تر ہوتا جا رہا ہے۔ چند گنے چنے خاندانوں میں دولت مرکوز ہوتی جا رہی ہے۔ پاکستان ایک غریب ملک ہے۔ یہاں کے عوام کی اکثریت کسانوں اور مزدوروں پر مشتمل ہے۔ اگر ان لوگوں کو بنیادی ضرورتیں ہی میسر نہ ہوں، مہنگائی سے ان کی کمر توڑ دی جائے اور اقتصادی بدحالی سے ان کے دماغ ماؤف ہو جائیں تو ایسی صورت میں ایک ہی صورت باقی رہ جاتی ہے کہ یا تو حکومت اپنی پالیسی تبدیل کرے یا پھر لوگ حکومت کو بدل دیں۔ موجودہ حکومت کی پالیسیوں سے جو دولت مند طبقہ پرورش پا رہا ہے ہم اس کی عیاشی کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ یہ ملک صرف اسلام کے لئے حاصل کیا گیا تھا تاکہ تمام لوگوں کو آزادی نصیب ہو۔ ان کی عزتِ نفس محفوظ رہے اور وہ غربت سے نجات حاصل کر سکیں اور ایک معمولی آدمی بھی حکمرانوں سے جواب طلبی کر سکے۔ اسلام سب کو زندگی بسر کرنے کے مساوی حقوق دیتا ہے۔ لیکن یہاں عوام کو یہ حقوق دینے سے انکار کر دیا گیا ہے۔ لوگ بڑی کٹھن زندگی گزار رہے ہیں۔ میں کہتا ہوں ایسی حکومت کو جو عوام کی بنیادی ضروریات بھی پوری نہ کر سکے قائم رہنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ پاکستان کسی کی جاگیر نہیں ہے۔ یہ چند خاندانوں اور ان کے جی حضوریوں کی بجائے بارہ کروڑ عوام کا وطن ہے۔ اور میرا مشن عوام کی حاکمیت کو بحال کرانا

ہے۔ یہ ملک حقیقی معنوں میں اسی وقت مستحکم ہو سکتا ہے جب اس کے معاملات عوام کو خوف دلانے والوں کی بجائے خدا کا خوف کھانے والوں کے ہاتھ میں ہوں۔ پاکستان اس لئے قائم کیا گیا تھا کہ پاکستانی عوام اسلام کے اصولوں کے مطابق خوش و خرم زندگی بسر کریں۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ آج ایک پاکستان کی بجائے تین پاکستان ہیں۔ ایک تو وہ پاکستان ہے جس کے متعلق حکومت کے ذرائع اطلاعات ریڈیو، ٹیلی ویژن وغیرہ بالکل الگ تاثر پیش کرتے ہیں۔ دوسرا پاکستان وہ ہے جس میں غربت و افلاس کا دور دورہ ہے۔ اور تیسرا پاکستان وہ ہے جس کا خواب حکیم الامت علامہ اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ نے دیکھا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کو اپنے قیام کے وقت جو خطرہ لاحق تھا اس سے کہیں بڑے اور شدید خطرے سے وہ اِس وقت دوچار ہے۔ حکومت تو اپنے ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اخبارات کے ذریعے پاکستان کے بارے میں یہ تاثر دے رہی ہے کہ یہاں زبردست ترقی ہوئی ہے اور اسی لئے "دس سالہ سنہری دور" کی خوشی میں جشن منایا گیا۔ یہ الگ بات ہے کہ لوگ ترقی کے اس دعوے سے متاثر بھی ہوئے ہیں یا نہیں۔ دراصل پاکستان میں خود غرضی، لالچ، بد دیانتی وغیرہ نے سخت بے چارگی اور مایوسی کی کیفیت پیدا کر رکھی ہے اس میں یتیم گلیوں میں بھیک مانگتے ہیں۔ لاکھوں افراد کو رہنے کے لئے کوئی جگہ میسر نہیں۔ بیوائیں اور

بوڑھے کس مپرسی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہر مہذب معاشرے میں روٹی اور کپڑا مہیا کرنا حکومت کا فرض ہوتا ہے لیکن پاکستان میں حکومت اس احساس سے بیگانہ ہے۔ قائد اعظمؒ اور لاکھوں مسلمانوں نے جس پاکستان کا خواب دیکھا تھا اس میں امیر اور غریب، طاقتور اور کمزور کو ایک ہی سطح پر رکھنا مقصود تھا۔ ایسے پاکستان میں ہر کسی کو خوراک اور کپڑا مہیا کرنا حکومت کا اوّلین فرض ہوتا۔ آزادئ تقریر پر کوئی پابندی نہیں ہو سکتی تھی۔ اور ہنگامی حالات کے نفاذ کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ممکن ہے کچھ لوگ ایسے بھی ہوں جو یہ خیال کرتے ہوں کہ انھیں پاکستان میں سب کچھ مل گیا ہے اور اب صرف جشن منعقد کرنا باقی ہے۔ لیکن سورج طلوع ہونے پر اس کے اعلان کی ضرورت نہیں رہتی۔ وہی قوم فارغ البال کہلانے کی مستحق ہوتی ہے جہاں حکمرانوں اور عام لوگوں کو مساوی حقوق حاصل ہوں۔

رشوت و کنبہ پروری۔ ملک میں رشوت ستانی، اقربا پروری اور ناجائز مراعات دینے کی روش عام ہو گئی ہے۔ تمام سرکاری محکموں میں رشوت بڑھ چکی ہے اور بڑے بڑے افسر اس کے ذمہ دار ہیں۔ میں یہ بات نہیں مان سکتا کہ رشوت کا قلع قمع نہیں کیا جا سکتا۔ اگر وزراء اور بڑے بڑے افسر دیانتدارانہ اور ایماندارانہ زندگی کی مثال پیش کریں تو رشوت کیا تمام برائیوں کا مکمل طور پر قلع قمع کیا جا سکتا ہے۔ مگر افسوس کہ حکومت کی مشینری ہمیشہ پٹواریوں چپڑاسیوں

اور دوسرے چھوٹے چھوٹے ملازمین کا محاسبہ کرتی ہے اور بڑے بڑے افسروں اور وزیروں کو نظر انداز کر دیتی ہے۔

آزادیٔ رائے کے اظہار پر قدغن۔ اس وقت ملک میں آزادیٔ تقریر و تحریر پر طرح طرح کی پابندیاں عائد ہیں۔ اکثر اخبارات، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور دوسرے ذرائع نشر و اشاعت پر حکومت کا کنٹرول ہے۔ ان اداروں میں اگرچہ اچھے لوگ بھی کام کرتے ہیں مگر اس کے باوجود ان اداروں کو صرف حکمران طبقے کے پروپیگنڈے کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔ ان میں کام کرنے والے عمدہ لوگوں کی اپنی کوئی آواز نہیں ہے۔ وہ وہی کچھ کر رہے ہیں اور اس کے کرنے پر مجبور ہیں جو حکمران طبقہ ان سے کرا رہا ہے۔ اس صورتِ حال نے عوام کے لئے اپنی رائے کا اظہار کرنا تقریباً ناممکن بنا دیا ہے۔ یہ کتنی شرمناک بات ہے کہ ملک میں اظہارِ رائے پر پابندی کے باعث ہمیں غیر ملکی اخبارات کا سہارا لینا پڑ رہا ہے۔ میں اس بات کو اچھی طرح جانتا ہوں کہ کارکن صحافی بالکل مجبور ہیں اور وہ جن حالات میں کام کر رہے ہیں ان پر خوش نہیں ہیں۔ مجھے ان سے بڑی ہمدردی ہے حکمران طبقے نے ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اخبارات کو اپوزیشن جماعتوں کے لئے ممنوع بنا رکھا ہے۔ ملک کے اندر کی فضا اتنی گھمبیر ہو رہی ہے کہ جو لوگ بھی ملک و قوم کی خدمت کرنا چاہتے ہیں ان پر عوام سے رابطہ کے

دروازے بند کیے جا رہے ہیں۔ یہاں معززین کے ٹیلیفون ٹیپ ہو رہے ہیں، ان کی نگرانی کی جاتی ہے اور انھیں مختلف طریقوں سے ہراساں کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ایسی کارروائیوں سے ملکی مسائل ہرگز حل نہیں ہو سکتے۔ اس صورتِ حال کے خلاف عوام کا اگر شدید ردِ عمل ہوتا ہے تو یہ فطری امر ہے۔ ایسے حالات میں جبکہ ملک بحرانی کیفیت میں مبتلا ہے اور حکومت نے پبلسٹی کے ہر ادارہ پر عملاً قبضہ کر رکھا ہے اور چند ایک اخبارات کو چھوڑ کر تمام اخبارات کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لیا ہے۔ عوامی مسائل سلجھنے کی بجائے مزید الجھ کر رہ گئے ہیں۔ اخبارات کے ساتھ حکومت جو سلوک کر رہی ہے اور جس طرح انھیں خبروں کے بائیکاٹ پر مجبور کیا جا رہا ہے اس کے پیشِ نظر مجھے اب مزید کسی پریس کانفرنس کرنے کا حوصلہ ہی نہیں پڑتا۔ یہ نیشنل پریس ٹرسٹ جو بنایا گیا ہے یہ انتہائی خطرناک حربہ ہے اس کو جلد سے جلد ختم کرانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اس کی موجودگی میں نہ اخبارات آزاد ہو سکتے ہیں اور نہ صحافی۔ اس کی وجہ سے صحافی مجبور ہو کر رہ گئے ہیں۔ میں کارکن صحافیوں کی یونینوں کے لیڈروں سے صحافیوں کے مسائل اور مشکلات پر غور و فکر کر کے انھیں حل کرانے کی کوشش کروں گا۔

حکومت کی غلط پالیسیوں کی وجہ سے جگہ جگہ دفعہ ۱۴۴ نافذ ہے۔ شہری آزادیوں پر طرح طرح کی پابندیاں لگائی جا رہی ہیں۔ عوام سے ملنے کے

مواقع ختم کر دیئے گئے ہیں۔ ان حالات کو سدھارنے کے لئے بڑی دانشمندی اور حب الوطنی کی ضرورت ہے۔ اور اسی طرح تحریک چلانے کی ضرورت ہے جیسے قیامِ پاکستان کے لئے چلائی گئی تھی۔ اگر ہم متحد و منظم ہوکر موجودہ حکومت پر دباؤ ڈالیں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ رائے عامہ کے سامنے جھکنے پر مجبور نہ ہو۔ کوئی بھی حکومت رائے عامہ کو زیادہ عرصہ تک نظر انداز نہیں کر سکتی۔

ہنگامی حالات کا نفاذ۔ اس وقت ملک میں ہنگامی حالات کا نفاذ ہے۔ میں وکلاء کی طرح آئین کی باریکیوں کو پوری طرح نہیں سمجھ سکتا۔ تاہم ایک عام شخص ہونے کی حیثیت سے میں نے آئین کو بغور سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ہنگامی حالات نافذ کرنے کے لئے یہ بنیادی شرط ہے کہ یہ ہمیشہ انتہائی ناگزیر اور مشکل ترین صورت حال کے پیدا ہوجانے پر نافذ کئے جاتے ہیں۔ ہنگامی حالات کا نفاذ ایک اہم مسئلہ ہے۔ اگرچہ یہ آئین کا ایک حصّہ بھی ہیں مگر ان کا نفاذ اس طرح ہونا چاہیئے کہ عام شہریوں کی عزتِ نفس پر حملہ نہ ہونے پائے۔ میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں۔ ہے کہ ملک کو اس وقت داخلی اور بیرونی خطرات کا سامنا نہیں ہے مگر اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہنگامی حالات کا نفاذ کرتے وقت صورتِ حال کے تمام پہلوؤں کا اچھی طرح سے جائزہ لینا چاہیئے۔ اگر کسی حکومت کے نزدیک ملک کو فی الحقیقت ہنگامی

حالات کے نفاذ کی ضرورت پیدا ہو گئی ہو تو ایسی صورت میں حکومت کا اولین فرض یہ ہوتا ہے کہ وہ خطرات کا مقابلہ کرے اور قومی دفاع کے لئے عوام کو پوری طرح تیار کرے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ انتظام کرے کہ عوام کے حقوق بھی بحال رکھے جائیں تاکہ اس طرح سے ان میں حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے خود اعتمادی اور قوتِ عمل زیادہ پیدا ہو سکے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ حکومت اس اہم فریضہ کو انجام دینے سے گریز کی پالیسی پر عمل پیرا ہے۔ اس طرح کوئی بھی حکومت اصلی مقصد حاصل نہیں کر سکتی۔ اس کے برعکس ہنگامی حالات کو محض ایک مخصوص طبقے کو برسراقتدار رکھنے کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔ جس کا کوئی جواز نہیں ہے۔

طلباء کے مسائل۔ حکومت طلبہ کے مسائل اور ان کی مشکلات سمجھنے میں ناکام رہی ہے۔ طلبہ کے مسائل بنیادی نوعیت کے ہیں۔ اور آئے دن طلبہ کو یہ بتانا کہ حکومت آپ کے مطالبات پر غور کر رہی ہے۔ بڑا احمقانہ مذاق ہے۔ اس وقت تعلیمی اداروں کے حالات انتہائی ناگفتہ بہ ہیں۔ کالجوں اور اسکولوں میں نہ ضروری سامان ہے اور نہ ضروری عملہ۔ لیکن نئے اسکول اور کالج کھول کر ترقی و تعمیر کے دعوے کئے جا رہے ہیں۔ جب موجودہ اسکولوں اور کالجوں کی حالت کو بہتر نہیں بنایا جا سکتا

تو نئے اسکول اور کالج کھولنے کا کیا فائدہ ہے۔

ہمارے ہاں تعلیمی ڈھانچہ از کار رفتہ ہے۔ اور موجودہ دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں۔ اس کی تشکیل میں مناسب منصوبہ بندی نہیں کی گئی۔ جس کی وجہ سے وہ انحطاط سے دوچار ہے۔ اب اس ڈھانچے کو تبدیل کرنے کی شدید ضرورت ہے۔ اس وقت سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ تعلیمی مشکلات کو دور کرنے اور طلبہ کے مسائل حل کرنے کیلئے نہ تو طلبہ کے نمائندوں کا زاویہ نگاہ معلوم کیا جاتا ہے اور نہ ہی انہیں اعتماد میں لینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ حکومت طلبہ کے مسائل حل کرنا نہیں چاہتی۔ وہ طلبہ کو چند نام نہاد مراعات دے کر خوش کرنا چاہتی ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ طلبہ کے طبقہ میں جب بھی اپنے مسائل کے متعلق بے چینی پیدا ہوتی ہے اور وہ اپنے دیرینہ مطالبات منظور نہ ہونے سے گھبرا اٹھتے ہیں تو تعلیمی ادارے بند کر دیئے جاتے ہیں۔ حالانکہ تعلیمی ادارے بند کر دینے سے ان کے مسائل حل نہیں ہو جاتے بلکہ الٹا قومی نقصان ہوتا ہے۔ تعلیمی ادارے بند کر کے اسکولوں اور کالجوں کے بچوں کو گلیوں اور سڑکوں پر لے آنا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ اب تو حالت یہ ہے کہ پرائمری اسکولوں کے بچے بھی ایجی ٹیشن میں حصہ لینے لگے ہیں۔ اگر ایسا ہی رہا تو وقت آئے گا کہ ماؤں

کی گود میں موجود بچے بھی تحریک میں شامل ہونے لگیں گے۔ حکومت کا فرض ہے کہ وہ درسگاہیں کھول دے۔ اور طلبہ کی تکالیف دور کرنے کے لئے ان کے سامنے آئے۔ اگر ملک میں تعلیم کا حصول ناممکن بنا دیا جائے گا تو کیا بچوں کو تعلیم حاصل کرنے کے لئے امریکہ یا یورپ بھیجا جائیگا۔

پولیس ملازمین ہمارے بھائی ہیں۔ میں ان سے اپیل کرتا ہوں کہ بچوں پر تشدد نہ کریں۔ صبر و تحمل سے کام لیں۔ یہ آپ ہی کے بچے ہیں۔ انھیں گولیوں اور ڈنڈوں کا نشانہ نہیں بنانا چاہیئے۔ طالب علموں کو بھی میری تلقین ہے کہ وہ بھی صبر و تحمل سے کام لیں۔ جوش و خروش اپنی جگہ بہت ضروری ہوتا ہے۔ لیکن ہم جس دور سے گزر رہے ہیں اور جس جدوجہد کا ہم نے آغاز کیا ہے۔ اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ قانونی اور آئینی ذرائع اختیار کئے جائیں۔ صرف اسی طریقے سے حکومت بدلی جا سکتی ہے۔ تشدد یا ڈنڈے کے زور سے جو حکومت قائم ہوتی ہے وہ عوام کی حکومت نہیں ہوتی۔ سرکاری یا نجی املاک کو نقصان پہنچانے سے ایک تو ملک اور قوم کا نقصان ہوتا ہے اور دوسرے ہماری صلاحیتیں غلط راستے پر لگ جاتی ہیں۔ اور ان عناصر کو آگے آنے کا موقع مل جاتا ہے جنھیں نہ تو طلبہ کا مفاد عزیز ہے اور نہ ملک و ملت کی فلاح مطلوب ہے۔ ایسے غیر ذمہ دار اور جذباتی لوگوں کے آگے آجانے سے تحریک کو نقصان پہنچے گا۔

اور حکومت کو عوامی جذبات اور امنگوں کو کچلنے کا موقع مل جائے گا۔ طلبہ کو چاہیئے کہ اپنے جذبات کو قابو میں رکھیں اور ظہیر نقوی (راولپنڈی میں شہید ہونے والے ایک طالب علم) نے اپنے خون سے مکمل جمہوریت کی خاطر جس جدوجہد کا آغاز کیا ہے اسے پرامن طریقے سے جاری رکھیں۔

خارجہ پالیسی۔ خارجہ پالیسی کے سلسلے میں سردست میں کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ تاہم اتنا ضرور کہوں گا کہ خارجہ پالیسی ملک کے داخلی حالات کے تابع ہوتی ہے۔ اس لئے جب تک ملک کے داخلی مسائل کو حل نہیں کیا جاتا اس وقت تک خارجہ پالیسی کے بارے میں کچھ کہنا موزوں معلوم نہیں ہوتا۔ جب ہمارے گھر کی حالت بہتر ہو جائے گی تو بیرون ملک بھی ہماری قدر و منزلت از خود بڑھ جائے گی۔ فی الحال ہمیں خارجہ پالیسی کی بحث میں پڑ کر اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہیئے۔ اس سے اصل مقصد آنکھوں سے اوجھل ہو جائے گا اور جمہوریت کی بحالی کی مہم سے ہماری توجہ ہٹ جائے گی۔

مسئلہ کشمیر۔ مسئلہ کشمیر کے متعلق میں کہوں گا کہ حکومت اسے سنجیدگی سے طے کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ اور یہ سب کچھ جان بوجھ کر کیا جا رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اپوزیشن بھی حکومت کو دیانت داری کے ساتھ یہ مسئلہ حل کرنے پر مجبور نہیں کر سکی۔ اور کوئی معقول دباؤ نہیں ڈال سکی مسئلہ

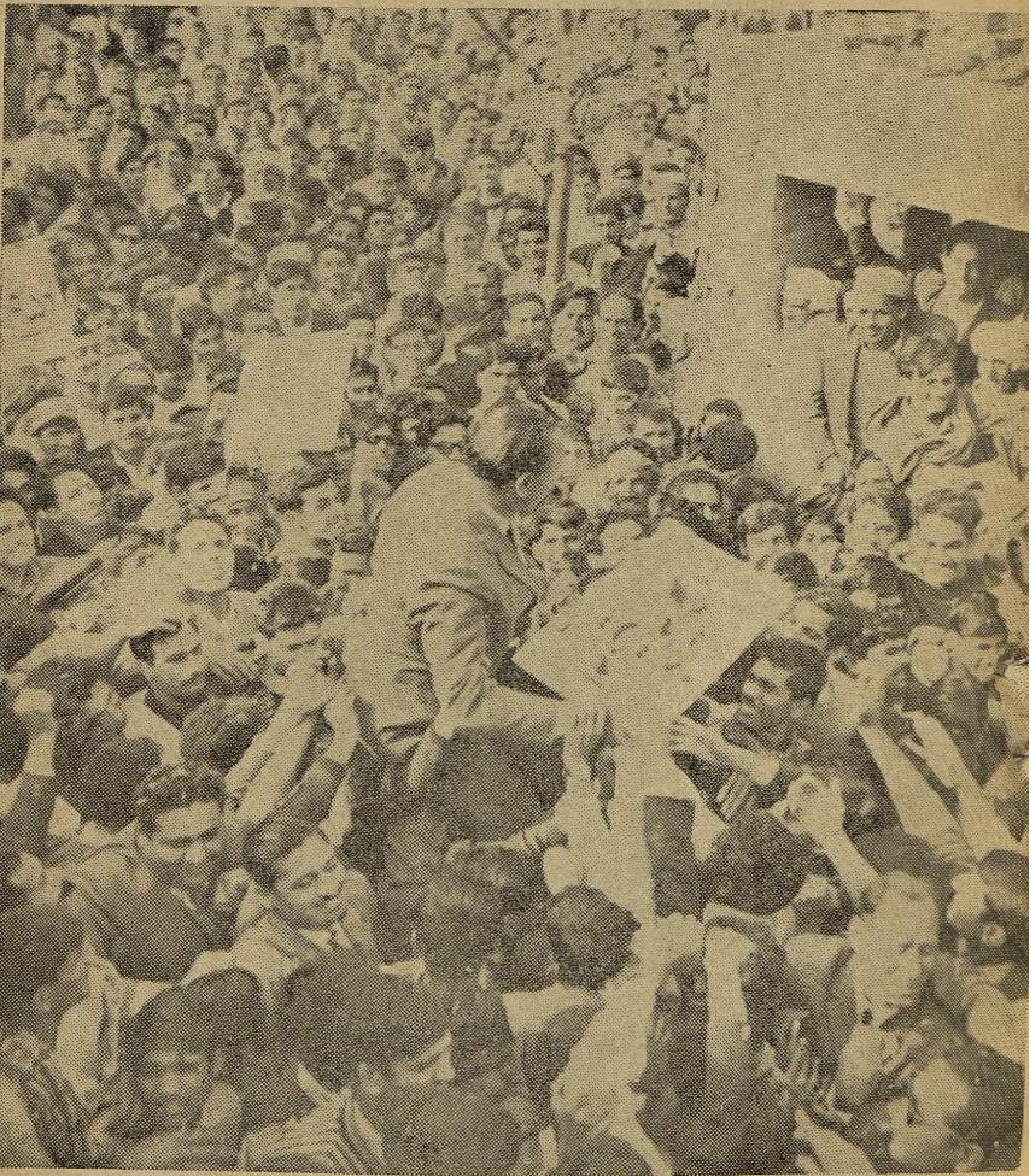
کشمیر کا ایک حل یہ ہے کہ خود پہلے آزاد کشمیر میں جمہوریت بحال کی جائے۔ تاکہ مقبوضہ کشمیر کے عوام کو کوئی ایسی برتر چیز نظر آئے جس کی وہ آرزو کر سکیں۔ آزاد کشمیر کے موجودہ غیر جمہوری حالات سے حد بندی لائن کے اس پار رہنے والے کشمیریوں کو مایوسی ہوئی ہے۔ اگر مسئلہ کشمیر کا معنی خیز اور پائیدار حل مقصود ہے تو لوگوں کو ملک کے دفاع کے لئے پوری طرح تیار کرنا چاہیئے۔ لیکن اس ضمن میں بھی حکومت کا اندازِ فکر درست نہیں ہے میرے ذہن میں اس مسئلے کا ایک حل ہے لیکن میں اس کا اظہار ابھی نہیں کروں گا۔ اگر ہماری موجودہ حکومت کشمیر کے بارے میں کھوکھلے نعروں سے اجتناب کرے۔ تو ہم تصفیہ کشمیر کی جانب ایک قدم آگے بڑھ سکتے ہیں۔

موجودہ آئین ۔ موجودہ آئین اس طرح بنایا گیا ہے کہ فردِ واحد کی حکومت ہمیشہ قائم رہ سکے۔ اور اس کے دوام کی ضمانت دی جا سکے۔ یہ آئین اصل میں بہت پہلے، اکتوبر ۵۸ء کے انقلاب سے بھی پہلے بنا لیا گیا تھا۔ لیکن عوام اس کو موجودہ شکل میں بالکل مسترد کر چکے ہیں۔ اس آئین کا احترام خود حکومت کے کارندوں نے ختم کر دیا ہے۔ اس سال کے اوائل میں صدرِ مملکت کی بیماری کے دوران اس کا کوئی احترام نہ کیا گیا۔ بلکہ صریح خلاف ورزی کی گئی۔ حالانکہ ایسے مسئلے پر آئین قطعی واضح ہے۔ صدرِ مملکت کی

بیماری کے دوران سپیکر کو ان کی جگہ کام کرنے کا موقع نہ دے کر آئین کی صریح خلاف ورزی کی گئی ہے۔ اگر آئین بنانے والے کی زندگی میں ہی حکومت نے آئین کا یہ "احترام" کیا ہے تو ان کے بعد اس کا حشر کیا ہوگا۔ افسوسناک امر تو یہ ہے کہ آئین کی اس صریح خلاف ورزی کے خلاف کسی وزیر کو بھی احتجاج کرنے کا یا استعفا دینے کی جرأت نہ ہوئی۔ کیونکہ یہ وزراء خود راسخ العقیدہ نہیں۔

وکلاء کی ذمہ داری۔ وکیل معاشرہ میں انتہائی طاقت ور ترجمان ہوتے ہیں، اور قوم کو بہترین قیادت مہیا کر سکتے ہیں۔ اس لئے انھیں اپنے عوام کی رہنمائی کے سلسلے میں اپنے فرائض کی ادائیگی میں پیچھے نہیں رہنا چاہیئے۔ مجھے یقین ہے کہ ہمارے ملک کے وکیل جمہوریت کے قیام اور عوام کے حقوق کی بحالی میں نمایاں کردار ادا کر سکتے ہیں۔ میں وکلاء سے اپیل کرتا ہوں کہ جن اقدار کی خاطر پاکستان حاصل کیا گیا تھا ان کے احیاء کے لئے وہ اپنا مؤثر کردار ادا کریں۔

مشرقی پاکستان۔ مشرقی پاکستان کو اپنا امیدوار خود نامزد کرنا چاہیئے۔ اگر آئندہ انتخاب میں مشرقی پاکستان کا نمائندہ منتخب ہو جائے تو مغربی پاکستان کے لوگوں کو اس سے بڑی خوشی ہوگی۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے عوام واضح طور پر اپنا یہ فیصلہ دے چکے ہیں کہ وہ اب موجودہ حکومت کو



سیالکوٹ میں عوام نے ایئر مارشل کو کاندھوں پر اُٹھا رکھا ہے۔
آپ کے ہاتھ میں ''آمریت ختم کرو'' کا بینر ہے۔



ایئر مارشل ، مظفر گڑھ میں شہریوں سے خطاب کر رہے ہیں -

نہیں چاہتے۔ ملک کے دونوں حصوں کے عوام نے یہ عزم کرلیا ہے کہ وہ ایسی حکومت کو اپنی مرضی کی جمہوری حکومت میں بدل دیں گے مغربی پاکستان کے عوام پہلے ہی بیدار ہو چکے ہیں۔ ان کی آنکھیں اب مشرقی پاکستان کے بھائیوں کی طرف لگی ہیں۔ مشرقی پاکستان کے لوگ اگر اس سلسلے میں رہنمائی کریں تو مغربی پاکستان کے بھائیوں کو بڑی خوشی ہوگی میں مغربی اور مشرقی پاکستان دونوں کے لئے زیادہ سے زیادہ ممکن حد تک خود مختاری کا حامی ہوں۔ کیونکہ اس طرح پاکستان زیادہ مضبوط اور خوشحال بن سکتا ہے۔ میں نے مغربی پاکستان کا دورہ کرکے یہ محسوس کیا ہے کہ مغربی پاکستان کے لوگ مشرقی پاکستان کے بھائیوں کے لئے بے پناہ عقیدت رکھتے ہیں۔ اور وہ مشرقی پاکستان میں رہنے والے بھائیوں کے شانہ بشانہ بحالی جمہوریت کی مہم میں جدوجہد کے لئے تیار ہیں۔

آنے والا انتخاب۔ آئندہ صدارتی انتخاب غیر جانبدارانہ اور آزادانہ ہونا چاہیئے۔ اگر سرکاری دباؤ اور ناجائز ذرائع انتخاب کو متاثر کرنے کے لئے استعمال کئے گئے تو پاکستان میں جمہوریت کا احیا ایک خواب بن کر رہ جائے گا۔ اور اگر آئندہ آنے والے انتخاب بھی گزشتہ انتخاب کی طرح ہوئے تو حکومت کی طرف سے جمہوریت کا نعرہ لگانے کا کوئی جواز نہیں ہوگا چار سال قبل جو انتخابات ہوئے تھے وہ آزادانہ و منصفانہ نہیں تھے۔ اور

اور لوگوں کا تأثر یہ بھی ہے کہ آئندہ انتخابات بھی آزادانہ نہیں ہوں گے۔ اس لئے حکومت کا فرض ہے کہ وہ انتخابات پر عوام کا اعتماد بحال کرے۔ میں نے مشرقی اور مغربی پاکستان کے دورے سے محسوس کیا ہے کہ لوگ بالغ رائے دہی کی بنیاد پر انتخاب چاہتے ہیں۔ نیز میں سمجھتا ہوں کہ آنے والے انتخابات صرف اسی صورت میں آزادانہ و منصفانہ ہو سکتے ہیں کہ صدرِ مملکت انتخابات سے دو ماہ پہلے مستعفی ہو جائیں اور عنانِ اقتدار چیف جسٹس کے حوالے کر دیں۔ اسی طرح ان کے ایجنٹ دونوں صوبائی گورنروں کو بھی انتخابات سے دو ماہ پہلے مستعفی ہو جانا چاہیئے اور ان کی جگہ صوبائی چیف ججوں کو مقرر کیا جائے۔ میں اقتدار کسی خاص پارٹی یا شخص کو سپرد کرنے کا مطالبہ نہیں کر رہا ہوں بلکہ موجودہ حکومت سے صرف یہ مطالبہ کر رہا ہوں کہ وہ بالکل آزاد و منصفانہ انتخابات کا انتظام کرے تاکہ عوام ملک پر حکومت کرنے کے لئے اپنی مرضی کے مطابق نمائندے منتخب کر سکیں اور اسی لئے میں انتخابات سے دو ماہ قبل صدرِ مملکت اور صوبائی گورنروں کے مستعفی ہو جانے کا مطالبہ کر رہا ہوں تاکہ انتخابات میں کسی قسم کی بے انصافی نہ ہونے پائے۔

اِنڈولوی

"طلباء کے لئے میرا پیغام یہ ہے کہ وہ صبر و سکون اور نظم و ضبط سے کام لیں۔ حالات سے بد دل ہو کر اشتعال میں نہ آئیں کیونکہ اس سے ہمارے لئے اور رکاوٹیں پیدا ہوں گی۔ سرکاری املاک کسی فرد واحد کی جاگیر نہیں کہ انھیں نقصان پہنچایا جائے۔ یہ املاک پوری قوم کی ہیں اور ہمیں ہر حالت میں ان کی حفاظت کرنی چاہیئے۔ نظم و ضبط اور آئینی حدود میں رہ کر آپ جو کچھ بھی کر سکتے ہوں وہ بدستور کرتے رہیں۔"

"سیاسی جماعتوں کے لئے میرا پیغام یہ ہے کہ وہ اپنے مشترک پلیٹ فارم کو زیادہ سے زیادہ مضبوط بنائیں اور اندرونی اختلافات میں بالکل نہ اُلجھیں ..... ہمیں اس وقت جمہوریت کی بحالی کے لئے جدوجہد کرنا ہے۔ ہمیں اپنی سرگرمیوں میں اسی مقصد کو اولیت دینی چاہیئے۔ اگر یہ مقصد حاصل ہو گیا تو وہ تمام مقاصد بھی حاصل ہو جائیں گے جو جمہوریت کا تقاضا ہیں۔"

"بیرونی خطرات ہوں یا داخلی فتنے، ان سے پوری قوم ہی نپٹ سکتی ہے۔ ایک شخص خواہ کتنے ہی وسیع اختیارات کا مالک کیوں نہ ہو، کبھی ان مشکلات پر قابو نہیں پا سکتا۔ سیدھی سادی اور معمولی بات یہ ہے کہ قوم مستحکم ہوگی تو ملک مستحکم ہوگا اور قوم کمزور ہوگی تو ملک کمزور ہوگا۔"

ائیر مارشل اصغر خاں صاحب سے عقیدت و محبت کی داستان
اگرچہ زیادہ طویل نہیں ہے لیکن جتنی بھی ہے بہت دلکش، حسین اور
ایمان افروز ہے۔ اس داستان کا آغاز ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ سے
ہوتا ہے جب اس مملکتِ خداداد کی ننھی منی فضائیہ نے ایک قوی اور
دیو پیکر دشمن کی اچانک یلغار کو نہ صرف آگے بڑھ کر روکا تھا بلکہ اس پر
تابڑ توڑ حملے کر کے اسے اس قدر مفلوج کر دیا تھا کہ اگر یہ جنگ کچھ عرصہ
اور جاری رہتی تو اُس کی موت یقینی تھی۔ جنگ کے دوران میں جب پاکستان
کے شہری ریڈیو سے آدم پور، ہلواڑہ، جمشید نگر اور سری نگر کے ہوائی اڈوں
پر پاکستانی فضائیہ کی جاں فروشانہ بمباری کی رُوداد سنتے تو ان کے دلوں
سے بے اختیار دعاؤں کا چشمہ اُبل پڑتا تھا۔ اس چشمے سے سیراب ہونے
والی پہلی شخصیت ائیر مارشل اصغر خاں کی ہوتی تھی۔

صاحب کیا کہنے اصغر خاں کے۔

اس نے فضائیہ کے ایک ایک نوجوان کو ایسی تربیت
دی ہے کہ وہ دشمن کے دس بمبار طیاروں پر بھاری ہے۔

ہاں صاحب درست کہتے ہیں آپ اصغر خاں نے شب و
روز محنت کر کے ہماری ہوائی فوج کو ایک ناقابلِ تسخیر
قوت بنا دیا ہے۔

یہ اور اس قسم کے متعدد تعریفی کلمات اہلِ علم کی مجلسوں اور عام سوسائٹی
میں بار بار دہرائے جاتے تھے۔ اگرچہ اس وقت وہ ہوائی فوج کے سربراہ
نہ تھے لیکن اسے بنانے میں اُنھوں نے جو شب و روز محنت کی تھی
اس کا ہر جگہ اعتراف کیا جا رہا تھا۔ پھر اعلانِ تاشقند نے شہیدوں کے
لہو پر خاک ڈال دی اور جذبات دلوں میں گھُٹ کر رہ گئے۔ ایئر مارشل
اصغر خاں صاحب لوگوں کی داد و ستائش سے بے نیاز پی۔آئی۔اے
کا نظام چلاتے رہے اور آخر ایک دن اس منصب سے بھی سبکدوش ہو کر
ایبٹ آباد کے گوشۂ عافیت میں بیٹھ رہے۔

پھر اس محبت کی داستان نے ایک نیا رُخ موڑا۔ اسی سال شہدائے
ستمبر کی یاد منانے کے لئے جناب الطاف حسن قریشی ایڈیٹر اردو ڈائجسٹ
نے "الوانِ افکار" سجایا تو اصغر خاں صاحب اس میں مہمانِ خصوصی کی
حیثیت سے مدعو تھے۔ اہلِ علم کی اس مجلس سے خطاب کرتے ہوئے جناب
اصغر خاں نے ایک ایسی بات کہی جو پوری قوم کے دل کی دھڑکن بن گئی۔
اور جسے اگلے روز "نوائے وقت" نے اپنے اداریے کا عنوان بنا ڈالا۔ وہ بات

چھٹی: "پاکستان کی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت ہماری اولین ذمہ داری ہے۔"

مسلسل دو ڈھائی مہینے تک یہ بات ہر طرف گردش کرتی رہی کہ پاکستان کی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کیجئے۔ یہ سرحدیں ایک عظیم خطرے سے دوچار ہیں۔ ہمیں اس خطرے کی نزاکت کا احساس کرنا چاہیئے۔ یہ خطرہ خود ہمارے اندر پل بڑھ رہا ہے۔ آیئے ہم اس کے تدارک کی فکر کریں۔ وغیرہ وغیرہ۔ پھر دسمبر کے وسط میں پورے ملک میں ایک خوشگوار حیرت کے ساتھ یہ خبر سنی گئی کہ ایئر مارشل اصغر خاں صاحب خود میدان سیاست میں اتر آئے ہیں۔ اور جو بات انھوں نے ڈھائی تین ماہ پیشتر کہی تھی اس کی عظیم ذمہ داری کا بوجھ وہ اپنے کاندھوں پر محسوس کر رہے ہیں۔ سیاست میں آتے ہی انھوں نے سب سے پہلا خطاب لاہور کے وکیلوں سے فرمایا۔ ہائی کورٹ بار روم کے اندر اور باہر جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ بس کچھ نہ پوچھئے۔ لوگ والہانہ انداز میں اصغر صاحب پر سکوں کی بارش کر رہے تھے۔ اس موقع پر غیر ملکی اخبارات کے نمائندے بھی موجود تھے۔ اصغر صاحب نے وضاحتاً یہ بات فرمائی کہ پریس ٹرسٹ کے ذریعے تو میرے خیالات کی نشر و اشاعت ممکن نہیں ہے۔ ان سے آگاہ ہونے کے لئے محب وطن عناصر کو غیر ملکی اخبارات کی طرف رجوع

کرنا پڑے گا۔ اگرچہ ہمارے ملک کے لئے یہ بہت باعثِ شرم بات ہے لیکن کیا کیا جائے فی الحال اس کے سوا کوئی چارہ بھی نظر نہیں آتا۔

ادارہ "ایشیا" نے اسی روز یہ طے کیا کہ مجھے اصغر صاحب سے مل کر ان کے سیاسی افکار و نظریات کی پوری تفصیل معلوم کرنی چاہیئے تاکہ ایک ملکی ذریعے سے بھی ان کی تشہیر کا اہتمام ہو سکے اور اصغر صاحب کے سیاسی عزائم کھل کر عوام کے سامنے آجائیں۔ میں نے ۲۳ نومبر کو ایبٹ آباد میں ان سے ملنے کا پروگرام بنایا۔ ۲۲ نومبر کو وہ راولپنڈی میں بار ایسوسی ایشن سے خطاب کرنے والے تھے اور شام گئے تک اس شہر میں ان کی ملاقاتوں کا پروگرام تھا۔ میں ۲۲ کی سہ پہر کو راولپنڈی کے لئے روانہ ہوا۔ رات راولپنڈی میں ٹھہرا اور صبح ایبٹ آباد کی طرف سرگرم سفر ہو گیا۔ "نوائے وقت" کے ذریعے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ اصغر صاحب آج ایبٹ آباد بار ایسوسی ایشن میں دن کے گیارہ بجے تقریر کرنے والے ہیں۔ خواہش تو یہی تھی کہ بار والی تقریر بھی ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ لیکن بعض اوقات بہت سی خواہشوں پر آدمی کا بس نہیں چلتا۔ میرا ذہن تو سینکڑوں میل فی منٹ کی رفتار سے محوِ پرواز تھا۔ لیکن بس، اونچی نیچی پہاڑیوں کے نشیب و فراز کاٹتی ہوئی بہت آہستہ چل رہی تھی۔ جگہ جگہ مسافروں کو اتارنے چڑھانے کے لئے رکتی تو میں اپنے آپ میں پیچ و تاب کھانے

لگتا۔ بہرکیف دن کے بارہ بجے بس نے ایبٹ آباد کی حدود میں قدم رکھا. تو میرا دل کچھ بجھ سا گیا تھا۔ بس سے اتر کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہُوا تو جا بجا لوگ مختلف ٹولیوں میں بیٹھے ہوئے اصغر خاں صاحب کی بار روم والی تقریر پر تبصرہ کر رہے تھے۔

" یار تقریر تو اپنی جگہ ٹھیک تھی لیکن اس قدر محتاط انداز مجھے پسند نہیں آیا۔ ایئر مارشل کو کھل کر سامنے آنا چاہیئے۔"

" میں کہتا ہوں ایئر مارشل کھری کھری کیوں نہیں سناتے "

" بھئی کھری کھری تو سنائی ہے۔ انھوں نے ڈھکی چھپی کون سی رکھی ہے۔"

" ہاں ہے تو کھری کھری لیکن انداز ذرا جارحانہ ہو تو اچھا ہے۔ یوں لطف نہیں آتا۔ "

" جارحانہ انداز اختیار کرنے والوں کا حشر ہم دیکھ چکے ہیں۔ ہمیں ابھی ایئر مارشل سے بہت کام لینا ہے۔"

وکیلوں کی ایک ٹولی کی یہ گفتگو بڑی ہی دلچسپ تھی۔ میں اصغر صاحب کی کوٹھی پر حاضر ہُوا۔ تو وہ بوجہ مصروفیت اس وقت مجھ سے ملاقات نہ کرسکے۔ ہاں دوسرے دن بارہ بجے کا وقت دے دیا۔

دوسرے روز میں دن کے بارہ بجے پہنچا تو اس وقت بھی وہ باہر کا ب بیٹھے تھے۔ کہنے لگے۔ "سیاست میں قدم رکھتے ہی مجھے اپنے ایک ایک لمحے کا حساب رکھنا پڑ رہا ہے۔ ملک کے گوشے گوشے سے میرے اس اقدام کو سراہا گیا ہے اور ڈاک و تار کا تانتا بندھ گیا ہے ان خطوط میں میرے اس فیصلے پہ مبارکباد بھی ہے۔ خوش آمدید بھی ہے۔ تجاویز و مشورے بھی ہیں۔ دعوتیں اور بلاوے بھی ہیں۔ میں اخلاقی لحاظ سے اس بات کا پابند ہوں کہ جن لوگوں نے اس وسیع پیمانے پر میری حوصلہ افزائی کی ہے ان کا شکریہ بھی ادا کروں۔ اب آپ سمجھئے یہ کام مجھ سے کتنا وقت مانگ رہا ہے۔ آپ لاہور سے آئے ہیں کاش ایک خط لکھ کر اپنی آمد سے مطلع کر دیتے تاکہ میں آپ کو زیادہ وقت دے سکتا

میں نے کہا "مجھے آپ کی مصروفیت کا احساس ہے۔ میں آپ کا بہت کم وقت لوں گا۔"

اصغر صاحب کے چہرے پر ایک لطیف مسکراہٹ پھیل گئی۔

سرکاری ملازمت اور سیاست ۔ پھر ایک لمحہ ضائع کئے بغیر میں نے گفتگو کا آغاز کر دیا۔ سب سے پہلا سوال یہ تھا:

"کیا سرکاری ملازمت میں ہوتے ہوئے بھی آپ کے ذہن میں کوئی سیاسی پروگرام تھا؟"

"جی نہیں۔ ملازمت میں ہوتے ہوئے تو کبھی میرے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہیں آئی کہ سیاست میں حصہ لینا چاہیئے۔ اُس وقت حالات بُرے تھے یا اچھے مجھے ان سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ خصوصاً ایئر فورس کی ملازمت میں تو میں بالکل جذب ہو کر رہ گیا تھا۔ میں سوچتا تھا کہ ایئر فورس کی سربراہی ایک بہت اہم اور نازک فرض ہے جس سے عہدہ برا ہونے کے لئے مجھے شب و روز ایک کر دینے چاہئیں۔ میرے ذہن میں بار بار یہ بات آتی تھی کہ ہمارے دشمن ملک بھارت کی فضائیہ سازوسامان اور تعداد کے لحاظ سے چار گنا بڑی ہے۔ اگر کبھی اس کے ساتھ ہمارا ٹکراؤ ہوا تو ہم کیسے اس کے مقابلے میں ٹھہر سکیں گے۔ ہاں ایک ہی صورت ہے کہ ہم اپنے اندر صلاحیت اور استعدادِ کار بڑھائیں اور وہ جذبہ پیدا کریں جو اس چار گنا بڑی قوت پر حاوی ہو جائے۔ یہی وہ مشن تھا جس میں ہمہ وقت میں لگا رہا۔ ستمبر ۶۵ء میں میرے تربیت یافتہ نوجوانوں نے جو کارنامے انجام دیئے وہ سب کے سامنے ہیں۔

یہ سمجھ لیجئے کہ سرکاری ملازمت کسی برسر اقتدار گروہ کی چاکری کا نام نہیں ہے۔ جو لوگ سول اور فوج کے محکموں میں کام کر رہے ہیں اور قومی خزانے سے اس کا معقول معاوضہ پا رہے ہیں ان پر لازم ہے کہ وہ پورے

احساس ذمہ داری کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیں۔ قومی خدمت کے صلے میں قوم سے معاوضہ لینا لیکن برسرِ اقتدار سیاسی گروہ کے مذموم مقاصد کا آلۂ کار بننا یا اپنے تئیں اس فکر میں رہنا کہ قوم غافل ہو تو اس کے سینے پر چڑھ بیٹھیں ملک و قوم سے بیوفائی ہی نہیں بدترین قسم کی دشمنی ہے۔ کوئی محبِ وطن سرکاری ملازم کبھی ایسا نہیں سوچ سکتا۔"

اصغر خاں صاف اور سیدھے انداز میں بولتے رہے۔ ان کی کشادہ پیشانی پر نظر کرنے سے بات کا مفہوم اور نکھر جاتا تھا۔

جذبۂ حب الوطنی — "پھر اچانک آپ میدانِ سیاست میں کیسے داخل ہو گئے۔؟" میں نے رہوارِ گفتگو کو پھر مہمیز لگائی۔

"نہیں صاحب میں اچانک تو سیاسیات میں داخل نہیں ہوا۔ بہت سوچ سمجھ کر اور جذبۂ حب الوطنی سے مجبور ہو کر اس میدان میں اترا ہوں — اس کی تفصیل یہ ہے کہ ایئر فورس سے سبکدوش ہونے کے بعد جب میں نے پی۔ آئی۔ اے کے منتظمِ اعلیٰ کی حیثیت سے چارج سنبھالا تو اس دنیا سے متعارف ہوا جس سے میں اب تک بالکل کٹا ہوا تھا۔۔۔ پی۔ آئی۔ اے کی پروازیں ملک کے کونے کونے میں جاتی ہیں۔ اس طرح مجھے ہر گوشۂ ملک کے عوام سے ملنے اور ان کے حالات کو جاننے کا موقع ملا۔ میں نے دیکھا کہ لوگ ملک کے مستقبل کے بارے میں سخت فکرمند

ہیں۔ ان کے اندر ایک عام مایوسی اور بے چینی پائی جاتی ہے۔ وہ جب بھی ملک کے حالات پر گفتگو کرتے ہیں تو ان کا انداز سخت تشویش آمیز ہوتا ہے۔ گویا دور و نزدیک کہیں بھی انھیں راہِ نجات دکھائی نہیں دے رہی ہے۔

۷ مئی ۶۸ء کو میں پی۔ آئی۔ اے کے منصب سے سبکدوش ہوا تو اگرچہ اس وقت ملک کی پوری تصویر میرے سامنے آچکی تھی تاہم میرا ذہن سیاست میں حصہ لینے بارے کے بارے میں کچھ ایسا واضح نہ تھا۔ میری خواہش تھی کہ ایبٹ آباد کے گوشۂ امن و سکون میں بیٹھ کر اپنی فیملی کے ساتھ وقت گزاروں اور اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت میں دلچسپی لوں۔ لیکن دو چار ماہ بعد ہی میں نے یہ محسوس کر لیا کہ جس اضطراب نے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے اس کی لہریں میرے گھر سے بھی ٹکرا رہی ہیں۔ ایبٹ آباد جیسا خاموش شہر بھی اس بے اطمینانی کی زد میں ہے۔ ہر طرف رشوت خوری، بدعنوانی، اقربا پروری، اسمگلنگ اور چور بازاری کا چرچا ہے۔ جہاں کہیں بھی دو آدمی مل بیٹھتے ہیں یہی تذکرہ چھیڑ دیتے ہیں۔ شہر شہر میں دفعہ ۱۴۴ نافذ ہے۔ لوگوں کی زبانوں پر پہرے بیٹھے ہوئے ہیں اور نفرت کا ایک غبار ہے جو اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہا ہے۔ میرے اندر کے سپاہی نے مجھے مجبور

گیا کہ اب مجھے میدان میں اتر آنا چاہیئے۔ اب وقت خاموش رہنے یا غیر جانبدار رہنے کا نہیں ہے۔

میں سیاست میں حبِ جاہ یا حصولِ اقتدار کے لئے نہیں آیا ہوں۔ میں صرف اس بات کا خواہاں ہوں کہ قوم جبر و تشدد کے جنگل سے آزاد ہو جائے اور اپنی مرضی سے ایک آزاد فضا میں سانس لے سکے۔"

سرکاری پارٹی۔ "آپ جانتے ہیں کہ اس نظام میں اپوزیشن کو اپنے خیالات عوام تک پہنچانے کے مناسب ذرائع میسر نہیں ہیں۔ ان حالات میں کیا اصلاحِ احوال کی ایک صورت یہ نہ تھی کہ خود سرکاری پارٹی میں رائے عامہ کے مطابق تبدیلیاں لائی جائیں۔ اور یہ بیڑہ آپ اٹھاتے۔"

میرا یہ سوال اگرچہ تیکھا تھا لیکن اصغر صاحب نے اسے غور سے سُنا، اور بڑا دو ٹوک جواب دیا۔

"شاید کوئی اللہ کا بندہ یہ کارنامہ انجام دے سکتا ہو! میں اپنے اندر یہ اہلیت نہیں پاتا کہ سرکاری پارٹی کی اصلاح کر سکوں۔ وہ تو اب اصلاح کے مرحلے سے گزر چکی ہے۔ اس میں کوئی ایماندار آدمی پنپ نہیں سکتا۔ اور کوئی باضمیر آدمی اس میں رہنا گوارا نہیں کر سکتا۔"

میں تو آیا ہی اس مقصد کے لئے ہوں کہ جو حق بات ہے وہ ڈنکے کی چوٹ کہوں گا۔ اور کسی مداہنت سے کام نہ لوں گا۔ پھر بھلا ایک ایسی

پارٹی سے کیونکر اشتراکِ عمل کیا جا سکتا ہے جو ظلم کی پاسبان بنی بیٹھی ہے؟
کیا عوام بے شعور ہیں؟ ۔ موجودہ نظام کی طرف سے عموماً یہ دلیل دی جاتی ہے کہ عوام بے شعور ہیں اس لئے انھیں براہِ راست سیاست میں حصّہ نہیں لینا چاہیئے۔ کیا آپ کے نزدیک یہ دلیل کوئی وزن رکھتی ہے؟

اصغر صاحب نے غور سے میری طرف دیکھا۔

"کسی فردِ واحد کا یہ فیصلہ کر دینا کہ عوام بے شعور ہیں اور اسے دلیل بنا کر پیش کرنا آخر کس لحاظ سے قرینِ انصاف ہے۔ جو لوگ یہ فیصلہ کرتے ہیں وہ ذرا انگلی رکھ کر تو بتائیں کہ عوام نے اس اس مقام پر بے شعوری دکھائی ہے۔ یہاں یہاں اس کے شعور نے ٹھوکر کھائی ہے۔ اور اس اس جگہ اس سے غلطیاں سرزد ہوئی ہیں۔ اگر وہ ایسا نہیں کر سکتے اور یقیناً نہیں کر سکتے تو پھر انھیں کیا حق ہے کہ وہ عوام کو بے شعور ہونے کا طعنہ دیں اور اس بہانے وہ پوری قوم کے حقوق غصب کئے رکھیں۔ میں سمجھتا ہوں پاکستانی عوام دوسری قوموں کے مقابلے میں زیادہ سیاسی شعور سے بہرہ ور ہیں اور ان کا سب سے بڑا کارنامہ خود پاکستان کا قیام ہے۔ پاکستان انھوں نے براہِ راست ووٹوں کے ذریعے حاصل کیا ہے اور یہ قائم و دائم بھی اسی وقت رہ سکتا ہے جب انہی کی مرضی یہاں فیصلہ کن قوت ہو۔ کوئی ایک شخص یا گروہ اپنی من مانی نہ کرنے پائے۔"

ملکی استحکام۔ " آپ اس بات سے تو اتفاق کریں گے کہ ملک کو استحکام کی ضرورت ہے۔ کیا ایک مضبوط صدر ملک کو استحکام نہیں دے سکتا؟"

اصغر صاحب بولے ہیے مسکرائے

" کیا مضبوط صدر سے آپ کی یہ مراد ہے کہ وہ قوی الجثہ اور لمبے چوڑے ڈیل ڈول کا مالک ہو!"

" جی نہیں میرا مطلب یہ ہے کہ وہ وسیع اختیارات کا حامل ہو ملک میں صرف اسی کا فرمان چلے۔ اور کوئی بالاتر قوت اسے روکنے والی موجود نہ ہو"

میں نے قدرے خفیف ہو کر اپنی بات کی وضاحت کی۔

" اچھا تو آپ یہ چاہتے ہیں کہ پوری قوم کے ہاتھ کٹ جائیں اور صرف ایک آدمی کا ہاتھ صحیح سالم ہو۔ اگر قوم اپنی مرضی سے ہاتھ کٹانے پر آمادہ ہو تو ایک حد تک یہ بات مانی جا سکتی ہے کہ اس طرح ملک استحکام پذیر ہو جائے گا۔ لیکن جب پوری قوم ہاتھ کٹ جانے پر چیخ رہی ہو اور دہائی دے رہی ہو تو کون ذی ہوش آدمی اسے ملک کا استحکام کہے گا۔؟ بیرونی خطرے ہوں یا داخلی فتنے ان سے پوری قوم ہی نپٹ سکتی ہے۔ ایک شخص خواہ کتنے ہی وسیع اختیارات کا مالک کیوں نہ ہو وہ کبھی ان مشکلات پر قابو نہیں پا سکتا۔ سیدھی سادی اور اصولی بات یہ ہے کہ قوم مستحکم ہوگی تو ملک مستحکم ہوگا اور قوم کمزور ہوگی تو ملک کمزور ہوگا۔"

اصغر خاں صاحب کی یہ صاف گوئی دل میں اُترتی چلی گئی ۔

علاقائی تعصبات اور علیحدگی پسندی ۔ اس وقت ہمارا ملک ایک عجیب صورت حال سے دو چار ہے ۔ کہیں "جے سندھ" کا نعرہ لگایا جا رہا ہے ۔ کہیں پختونستان کا مطالبہ زور پکڑ رہا ہے اور کہیں ملک کے ایک بازو کو ہی علیحدہ کرنے کی ترکیبیں سوچی جا رہی ہیں ۔۔۔ آپ کے نزدیک ان تخریبی کارروائیوں میں کون سے عوامل کارفرما ہیں ۔ ؟"

میرے اس سوال پر اصغر صاحب ذرا سا چونکے ، پھر کہنے لگے :

" ہاں یقیناً ایک ایسی صورت حال ملک میں پیدا ہو گئی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اسے پیدا کرنے اور پروان چڑھانے میں حکومت کا ہاتھ زیادہ ہے ۔ میں راولپنڈی میں بھی یہ بات کہہ چکا ہوں کہ پختونستان کا مسئلہ پریس ٹرسٹ کے اخباروں میں اچھالا جا رہا ہے ۔۔۔ رہا مشرقی پاکستان میں علیحدگی پسندی کی تحریک کا معاملہ تو مجھے ابھی کچھ اس سے آگاہی نہیں ہے ۔ انشاء اللہ جلد ہی مشرقی پاکستان جا کر وہاں کے حالات سے واقفیت حاصل کروں گا ۔ لیکن جیسا کہ چوہدری محمد علی صاحب نے اپنی تقریروں میں کہا ہے کہ شیخ مجیب الرحمٰن کے چھ نکات کو ہوا دینے والی اور پریس ٹرسٹ کے اخبارات کے ذریعے انھیں اچھالنے والی خود حکومت ہی تھی ۔ جب پانی سر سے اُونچا ہو گیا تو اس نے اسے دبانے کی نہایت

بھونڈی تدبیریں اختیار کیں۔

اس انتشار کے پس منظر میں جو محرکات کارفرما ہیں ان کی تفصیل یہ ہے کہ عوام کو کاروبارِ مملکت میں شراکت حاصل نہیں ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ فوج اور سول سروس ان پر حکمرانی کر رہی ہیں ——— اور حکومت کی پالیسی بنانے اور بگاڑنے کا وہ کوئی اختیار نہیں رکھتے۔ اہم سے اہم قومی مسئلے پر ان کی کوئی رائے نہیں پوچھی جاتی اور برسرِ اقتدار گروہ ان کی کسی تکلیف کا ازالہ کرنے کی طرف متوجہ نہیں ہے۔ جب وہ چاروں طرف سے نجات کا کوئی راستہ نہیں پاتے تو اپنے اپنے گھروں کے دروازے بند کر کے کسی حد تک محفوظ ہو جانا چاہتے ہیں۔ کوئی پختونستان چاہتا ہے کوئی جے سندھ کا نعرہ لگاتا ہے۔ کوئی مشرقی پاکستان کی خودمختاری کا مطالبہ کرتا ہے۔ الغرض جتنے گھر ہیں اتنے ہی دروازے ہمیں بند ہوتے نظر آنے لگتے ہیں۔

میں یہاں اس بات کی بھی وضاحت کر دوں کہ انتظامیہ کا رول اس ملک میں نہایت شرمناک ہے۔ اگر وہ احساسِ ذمہ داری کے ساتھ اپنے فرائض بجا لائے تو بہت سے نقائص دور ہو سکتے ہیں۔ میں حکومت کو مشورہ دوں گا کہ وہ کچھ تو فرض شناسی کا ثبوت دے اور محض اپنے استحکام کے لئے ان باتوں کو ہوا نہ دے جو اس ملک کی سالمیت کے لئے

خطرناک ہو سکتی ہیں ۔"

پاکستان کی بنیاد ۔ " آپ کے نزدیک پاکستان کی بنیاد کیا ہے ؟"

" واہ صاحب یہ بھی کوئی اختلافی مسئلہ ہے ؟" اصغر صاحب کی آواز میں نشتر کی چبھن تھی ۔

" آپ درست کہتے ہیں لیکن یہ بات اگر بار بار دہرائی جاتی رہے تو زیادہ مناسب ہے ۔"

" اچھا تو پھر لکھ لیجیئے کہ ۔۔۔ پاکستان کی بنیاد اسلام اور صرف اسلام ہے ۔ اگر اس ملک میں اسلام باقی نہ رہا تو یہ اپنی ہئیت کے اعتبار سے کوئی اور چیز بن جائے گا ۔ پاکستان نہ رہے گا ۔ ہم پاکستانی اس لئے ہیں کہ مسلمان ہیں ۔"

" آپ کے نزدیک اسلام کو اس ملک میں نافذ کرنے کی کیا تدبیر ہو سکتی ہے ؟"

" الحمدللہ ہم سب مسلمان ہیں ۔ اگر اخلاص اور دیانت داری سے اسلام پر عمل کریں تو اسے ذریعۂ حکومت بنانے میں کوئی دشواری نہیں ہے ۔ تاہم قانون ، اخلاق ، معیشت ، معاشرت ، بین الاقوامی تعلقات اور ایسے ہی تمام گوناگوں معاملات میں اسلام کا نقطۂ نظر معلوم کرنے کے لئے اہلِ علم کی خدمات حاصل کی جا سکتی ہیں ۔ خدا کے

فضل سے ہمارے ہاں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو زندگی کے تمام معاملات میں اسلامی مزاج کے عین مطابق ہماری رہنمائی کر سکتے ہیں۔"

پی۔ ڈی۔ ایم سے اشتراکِ عمل ۔ "کیا آپ کی نگاہ میں کوئی ایسی جماعت ہے جو نظریۂ پاکستان کو فروغ دینے کے لئے پوری جد و جہد سے کام کر رہی ہو۔؟"

"میں سمجھتا ہوں کہ اپوزیشن میں جتنی بھی جماعتیں ہیں وہ کم و بیش اسی مقصد کے لئے کام کر رہی ہیں۔ کہیں یہ جذبہ زیادہ قوی ہے اور کہیں نسبتاً کمزور ہے۔"

"کیا آپ مستقبل قریب میں کسی سیاسی جماعت میں شامل ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں۔؟"

"وسیع تر قومی مفاد کے پیشِ نظر میں کسی ایک سیاسی جماعت سے وابستہ نہیں ہونا چاہتا بلکہ پی ڈی ایم کے پلیٹ فارم کو مستحکم کرنا چاہتا ہوں۔ میں لاہور میں چوہدری محمد علی، میاں ممتاز دولتانہ اور نوابزادہ نصر اللہ خاں سے سیاسی مسائل پہ تبادلۂ خیال کر چکا ہوں۔ مولانا مودودی ان دنوں پاکستان میں تشریف نہیں رکھتے اس لئے ان سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ جونہی وہ واپس آئیں گے میں ان سے ملنے کی کوشش

کروں گا۔ ان رہنماؤں سے ملاقات کے بعد میں اس نتیجہ پہ پہنچا ہوں کہ ہمارے درمیان ملک، کے سیاسی مسائل پر کامل اتفاق رائے پا یا جاتا ہے۔"

"آئندہ صدارتی انتخاب کے بارے میں آپ کیا رائے رکھتے ہیں؟"

"پی ڈی ایم جو بھی فیصلہ کرے گی میں اسے تقویت پہنچاؤں گا۔"

دائیں بازو اور بائیں بازو کی بحث۔ "آپ نے لاہور میں کہا تھا کہ مجھے دائیں اور بائیں بازو سے کوئی دلچسپی نہیں ہے میں صرف اسلام پر یقین رکھتا ہوں۔ بلاشبہ ایک سچے مسلمان کا یہی طرزِ عمل ہونا چاہیے لیکن یہ اصطلاح مغربی پریس کی وضع کردہ ہے۔ وہ جمہوریت پسندوں کو دائیں بازو سے تشبیہ دیتا ہے اور اشتراکیوں کو بائیں بازو سے ۔ اگر پاکستان میں ان دونوں عناصر کی مڈبھیڑ ہو تو آپ کس کا ساتھ دیں گے؟"

"میں اوّل الذکر عنصر کا ساتھ دوں گا۔ کیونکہ اسی راستے سے پاکستان میں اسلام آ سکتا ہے۔

جو لوگ نظریۂ پاکستان کے مخالف ہوں یا اس کی بنیاد کا انکار کرتے ہوں یا ایک ایسے سیاسی تصوّر کے حامل ہوں جو اسلام سے ٹکراتا ہو تو میں کبھی ان کے ساتھ تعاون نہیں کر سکتا۔"

دفاعِ ملک۔ "عوام دفاعِ ملک میں فوج کا کس طرح ہاتھ بٹا سکتے ہیں؟"

"میں اپنے مضمون میں اس بات کی وضاحت کر چکا ہوں کہ

حکومت کا فرض ہے کہ وہ عوام کو فوجی تربیت دے۔ انھیں فنونِ حرب کی تعلیم سے آراستہ کرے۔ یہی وہ طریقہ ہے جس سے ہم ایک بہت بڑے دشمن کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔

لیکن یہ کام وہی حکومت کر سکتی ہے جسے عوام پر اعتماد ہو، جو یہ بات سمجھے کہ عوام کا تربیت یافتہ ہونا ہی اس ملک کے دفاع کا ضامن ہے۔ جس حکومت کو یہ خدشہ ہو کہ عوام فوجی تربیت پاکر خود اس کا تختہ اُلٹ دیں گے وہ کب یہ "خطرہ" مول لے سکتی ہے۔

ہنگامی حالات:۔ "کیا ہنگامی حالات برقرار رکھنے کی ضرورت ابھی باقی ہے؟"

"اس ضرورت کا جواز تو اس وقت ہو سکتا تھا جب ہم واقعی کسی بیرونی خطرے سے نپٹنے کی تیاری کرتے۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ عوام کی فوجی تربیت کا انتظام کیا جاتا۔ لیکن جب ہنگامی حالات کا یہ تقاضا پورا نہیں کیا جا رہا تو پھر اس کے برقرار رکھنے کا کیا جواز باقی رہ جاتا ہے۔"

مسئلہ کشمیر۔ "آپ کے خیال میں مسئلہ کشمیر کس طرح حل ہو سکتا ہے؟"

"مسئلہ کشمیر اس وقت تک حل نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس ملک میں کوئی مضبوط نمائندہ حکومت قائم نہ ہو۔ ایسی ہی حکومت بین الاقوامی برادری میں اپنا رسوخ استعمال کر سکتی ہے۔ اور بڑی طاقتوں کو اس کے

حل پر مجبور کر سکتی ہے۔ اگر وہ یہ محسوس کرے کہ صرف جہاد ہی سے یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے تو یہ قدم بھی پوری قوم کے تعاون کے ساتھ اٹھایا جا سکتا ہے!

ابھی میرے پاس سوالوں کا انبار تھا لیکن اصغر صاحب بار بار پہلو بدل رہے تھے۔ میں نے کہا "بس میں اپنا کام ختم کرتا ہوں۔ سیاسی جماعتوں، طلباء اور عوام کے لئے کوئی پیغام دے دیجئے تاکہ وہ آپ کے پروگرام پر عمل کر سکیں۔"

سیاسی جماعتوں کے لئے۔ اصغر صاحب نے آہستہ سے فرمایا: "سیاسی جماعتوں کے لئے میرا پیغام یہ ہے کہ وہ اپنے مشترکہ پلیٹ فارم کو زیادہ سے زیادہ مضبوط اور مستحکم بنانے کی کوشش کریں۔ اور اندرونی اختلافات میں بالکل نہ الجھیں۔ انھیں ایک بہت بڑے چیلنج کا سامنا ہے۔ اگر انھوں نے اپنی صفوں میں اتحاد پیدا نہیں کیا تو مجھے خدشہ ہے کہ وہ مؤثر قوت سے اس چیلنج کا مقابلہ نہ کر سکیں گی۔

یاد رکھیئے ہمیں اس وقت جمہوریت کی بحالی کے لئے جدوجہد کرنا ہے۔ ہمیں اپنی تمام سرگرمیوں میں اسی مقصد کو اولیت دینی چاہئے۔ اگر یہ مقصد حاصل ہو گیا تو وہ تمام مقاصد بھی حاصل ہو جائیں گے جو جمہوریت کے لازمی تقاضے ہیں۔"

طلباء کے لئے۔ "طلباء کے لئے میرا پیغام یہ ہے کہ وہ صبر و سکون

اور نظم و ضبط سے کام لیں۔ حالات سے بددل ہو کر اشتعال میں آنے کی
کوشش نہ کریں کہ اس سے ہمارے لئے اور رکاوٹیں پیدا ہوں گی۔
سرکاری املاک کسی فردِ واحد کی جاگیر نہیں ہے کہ انھیں تباہ کر کے ہم
اپنا کلیجہ ٹھنڈا کر سکیں۔ یہ املاک پوری قوم کی ہیں اور ہمیں ہر کیف ان
کی حفاظت کرنی چاہیئے۔ ہاں نظم و ضبط اور آئینی حدود میں رہ کر طلباء
جو کچھ بھی کر سکتے ہوں وہ بدستور کرتے رہیں"
عوام کے لئے۔ "عوام سے میری گزارش یہ ہے کہ جمہوریت
اور آمریت کی اس لڑائی میں وہ خاموش تماشائی نہ بنے رہیں۔ سیاسی
جماعتیں انھیں کے حقوق کے لئے لڑ رہی ہیں۔ وہ اپنی قوت کا اسی
طرح ثبوت فراہم کریں جس طرح تحریک پاکستان کے وقت اُنھوں نے
فراہم کیا تھا۔ یہ جنگ عوامی تائید کے بغیر جیتی نہیں جا سکتی۔ میں سمجھتا ہوں
کہ عوام ملک کی موجودہ صورتِ حال سے سخت مضطرب ہیں اور براہ راست
وہی اس ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں۔ لیکن انھیں بے بس ہو کر بیٹھ نہیں
رہنا چاہیئے وہ اس جدوجہد میں آگے بڑھیں اللہ ان کے ساتھ ہے۔"
اصغر صاحب کے روشن چہرے پر عزائم کی بہت سی کرنیں جگمگا رہی تھیں۔
میرے دل سے دعا نکلی کہ اللہ تعالیٰ انھیں نظرِ بد سے بچائے اور قوم نے ان
سے جو توقعات وابستہ کی ہیں وہ پوری ہوں۔ (بشکریہ م۔ ف ہفت روزہ ایشیا لاہور)

مقالات

شاہینِ ملت ایئر مارشل محمد اصغر خاں کے وہ مضامین جو
آپ نے ۲۲ ستمبر ۱۹۶۸ء سے ۸ دسمبر ۱۹۶۸ء تک
مختلف ملکی اخبارات کے لیے سپردِ قلم کیے ان مضامین
میں بڑی جامعیت سے ملکی مسائل کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

دفاعِ پاکستان

جب پاکستان وجود میں آیا تو کئی لوگ یہ سمجھتے تھے کہ وہ اقتصادی استحکام سے محروم رہے گا۔ مگر ممالک کے پہلے ہی بجٹ اور پھر جنگِ کوریا سے پیدا شدہ حالات نے ہماری اقتصادی حالت کو قابلِ اعتماد ثابت کر دیا۔ لیکن پاکستان کی مدافعانہ قوت کے بارے میں شبہات کے ازالہ کے لئے ہمیں ۱۹۶۵ء تک انتظار کرنا پڑا۔

مغربی پاکستان میں بھارت کے ساتھ ہماری طویل سرحد، کشمیر پر بھارت کا غاصبانہ قبضہ، پاکستان کے مشرقی اور مغربی بازوؤں کے درمیان فاصلہ اور بھارت کے مقابلہ میں نسبتاً زمین کی وسعت کی کمی، یہ چند ایسے مسائل ہیں جن کے باعث پاکستان کے دفاعی مسئلہ کو عموماً ناقابلِ حل سمجھا جاتا ہے۔ بہرحال صداقت ظاہری سطح پر بہت کم نظر آتی ہے اور اس کو پانے کے لئے گہرائی میں جانا ضروری ہے۔ اگر ہم پاکستان کی جغرافیائی پوزیشن اور نسبتاً بڑے ہمسایہ ملک سے اس کے فوجی اہمیت کے تعلق کو گہری نظر سے دیکھنے کی کوشش کریں تو معلوم ہوگا کہ پاکستان کے محلِ وقوع سے کوئی ایسی دشواری پیدا نہیں ہوتی جس پر ہوشمندی اور ماہرانہ قیادت سے قابو نہ پایا جا سکتا ہو۔ وہی اسباب و عوامل جن کو بعض لوگ

کمزوری کا سبب سمجھتے ہیں دراصل پاکستان کو ایسی برتری عطا کرتے ہیں جن کو صحیح طریقے سے استعمال کیا جائے اور ان سے فائدہ اٹھایا جائے تو فوجی نقطۂ نظر سے وہ انتہائی مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔

کشمیر۔ پہلا اور غالباً سب سے اہم مسئلہ وہ ہے جو کشمیر پر بھارت کے فوجی قبضہ سے پیدا ہوتا ہے۔ لیکن خالص فوجی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ عام اعتقاد کے بالکل برعکس یہ مسئلہ پاکستان کی بہ نسبت بھارت کے لئے زیادہ پریشانی کا باعث ہے اور یہ اس لئے کہ بھارت کشمیر میں جتنی زیادہ فوج رکھنا ضروری سمجھے گا اتنی ہی اس کی عام فوجی پوزیشن کمزور ہوگی۔ کشمیر میں جمع ہونے والی افواج کھلے میدانوں کی اصل لڑائی میں اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتیں بلکہ کشمیر اور بھارت کے طویل اور دشوار گزار مواصلات کی وجہ سے ان افواج کو ہمیشہ کٹ جانے کا خطرہ لاحق رہے گا۔ ایسی صورت حال خواہ تھوڑے ہی عرصہ کے لئے پیدا ہو تو بھی اس سے بھارت کے لئے نہایت ہی تباہ کن سیاسی اور فوجی نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ اور اس سے جنگ کے دوسرے محاذوں پر اس کی دفاعی قوت بری طرح متاثر ہو سکتی ہے۔

یہ تو ظاہر ہی ہے کہ جب تک بھارت کشمیر پر اپنا جابرانہ تسلط قائم رکھے گا اس وقت تک اس کو وہاں بڑی تعداد میں افواج رکھنا پڑیں گی۔ کشمیر میں

افواج کی جتنی زیادہ ضرورت پڑتی جائے گی اسی نسبت سے دوسرے اہم محاذوں پر اس کی مجموعی دفاعی صلاحیت کمزور ہوتی جائے گی۔

جغرافیائی حالات۔ مغرب میں سیالکوٹ اور فیروزپور کا درمیانی علاقہ ایسا ہے جہاں بھارت وسیع پیمانہ پر فوجی کارروائی کر سکتا ہے وہاں مواصلاتی سہولتوں کی وجہ سے کثیر افواج کا اجتماع اور ان کی نقل و حرکت ممکن ہے۔ مگر فیروزپور سے آگے سندھ تک پاکستانی سرحد پر وہ ریگستانی علاقہ ہے جہاں بڑے پیمانہ پر نقل و حرکت کی سہولتیں موجود نہیں ہیں اس لئے اس طرف سے کسی بڑے حملے کا امکان نہیں ہے۔ اس علاقہ کی قدرتی رکاوٹوں سے ہمارا دفاعی مسئلہ بڑی حد تک آسان ہو جاتا ہے۔ البتہ سیالکوٹ سے فیروزپور تک کا علاقہ میدانِ جنگ بن سکتا ہے مگر اس میں بھی جا بجا نہریں اور دریا ہیں۔ جن کے بہاؤ کا رخ شمال سے جنوب کی طرف ہے اور یہ حملہ آور فوج کے لئے راستہ میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں۔ یہ موانعات ہماری صلاحیت کو بڑھانے میں معاون و مددگار کی حیثیت سے استعمال کئے جا سکتے ہیں۔

اسی طرح مشرقی پاکستان میں بعض مقامات پر دریاؤں کا پاٹ ایک میل چوڑا ہے۔ ہمارے علاقہ پر حملہ آور فوج کی راہ میں یہ ایک قدرتی رکاوٹ ہے۔ دریاؤں کے علاوہ اس علاقہ میں بکثرت درختوں اور جھاڑیوں کے وجہ

سے دفاعی سامان کو دشمن کی نظر سے پوشیدہ رکھنے کی ہماری صلاحیت بڑھ جاتی ہے۔ فوجی لحاظ سے یہ بات اور زیادہ اہمیت رکھتی ہے کہ بھارت کی سرحدیں مشرقی پاکستان کے مشرق، شمال اور مغرب میں ایک نصف دائرہ سا بناتی ہیں اور اس وجہ سے اُسے ایک محاذ سے دوسرے محاذ پر کمک پہنچانے کے لیے طویل فاصلے طے کرنے پڑتے ہیں۔ اس کے برعکس پاکستان کو ایک محاذ سے دوسرے محاذ پر امداد پہنچانے کے لئے کم وقت درکار ہوتا ہے۔ اور وقت موجودہ زمانے کی حربی کارروائیوں میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ جہاں مشرقی پاکستان کو اپنی جغرافیائی پوزیشن کے لحاظ سے بھارت پر برتری حاصل ہے وہاں بھارت پاکستان کے دو بازوؤں کے درمیان اپنی مرکزی پوزیشن سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتا۔ کیونکہ مشرقی اور مغربی پاکستان کا درمیانی فاصلہ اتنا طویل ہے کہ اس کے لیے اپنی افواج کو تیز رفتاری کے ساتھ ایک محاذ سے دوسرے محاذ پر منتقل کرنا ممکن نہیں ہے اس لئے عملاً ہر لحاظ سے پاکستان کے خلاف بھارت کے مشرقی اور مغربی محاذ ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہیں گے اور ایک دوسرے کی مدد نہیں کر سکیں گے۔ اگر ہم مشرقی پاکستان کی مرکزی پوزیشن سے پورا فائدہ اٹھانے کے لئے مدافعانہ طرزِ عمل کی بجائے پہل اور پیش قدمی کا رویہ اختیار کریں تو بھارت

ہمارے گرد پھیلے ہوئے علاقوں کے دفاع کے لئے نسبتاً بہت زیادہ تعداد میں افواج رکھنے پر مجبور ہو جائے گا۔ یعنی بھارت کو ہر محاذ پر ہر وقت کارروائی کے لئے مغربی بنگال سے لے کر آسام کے جنوبی اضلاع تک بھاری تعداد میں فوجیں متعین کرنا پڑیں گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مشرقی پاکستان کے ارد گرد اتنی کثیر افواج کا اجتماع اسی نسبت سے مغربی پاکستان کے خلاف کارروائی کے لئے بھارت کی طاقت کو کمزور کر دے گا۔ اسی طرح مقبوضہ کشمیر میں اور مغربی پاکستان کے بالمقابل بھارت کثیر افواج جمع کرے گا تو اس کو مشرقی پاکستان کے خلاف اپنی پوری طاقت استعمال کرنے کا موقع نہ مل سکے گا۔ گویا اس طرح پاکستان کے دونوں حصے ایک دوسرے کے معاون اور مددگار بن سکتے ہیں۔ اور جارحانہ کارروائی کے لئے بھارت کی اس قوت کو کمزور کر دیتے ہیں جس کا مجموعی استعمال ہمارے کسی ایک بازو کے خلاف فیصلہ کن ثابت ہو سکتا ہے۔ لہذا فوجی نقطۂ نظر سے پاکستان کا دو بازوؤں میں تقسیم ہونا اس کی مدافعانہ صلاحیت میں کمی کی بجائے اضافہ کا باعث ہوتا ہے۔

خارجہ تعلقات۔ شمال کی جانب چین کے ساتھ بھارت کے سرحدی تنازعے اس کے جنگی وسائل پر مزید اثر ڈالتے ہیں۔ یہ شمالی علاقے ایسے ہیں کہ بھارت کے لئے وہاں سے کسی وقت بھی اپنی فوجیں نکال کر دوسرے

محاذ پر بھیجنا آسان نہیں ہوگا۔ لیکن خوش قسمتی سے پاکستان کو مغرب میں ایران اور مشرق میں برما سے ملنے والی سرحدوں پر فوجیں متعین کرنے کی ضرورت نہیں۔ حتیٰ کہ افغانستان سے ملنے والی سرحد پر بھی کسی ایسی گڑبڑ کا اندیشہ حقیقی صورت میں نہیں پایا جاتا۔ اگرچہ افغانستان سے ہمارے دوستانہ تعلقات ایران کی طرح مضبوط نہیں ہیں تاہم مذکورہ بالا حالات میں ہمارے درمیان کسی حقیقی مخاصمت کا خطرہ موجود نہیں ہے۔ اپنے ہمسایہ اسلامی ممالک کے متعلق افغانستان جو جذبات اور احساسات رکھتا ہے ان کے بارے میں ہمارے اعتماد میں کمی آنے کا امکان نہیں۔

مغرب میں ایران و افغانستان اور مشرق میں برما جیسی مملکتوں سے قریب تر تعلقات قائم کرنے کی کوشش ہمارے مفاد میں ہے۔ یہ ہمسائے ہم کو قریبی تعلقات کے ایسے امکانات مہیا کرتے ہیں جن کی بڑی سیاسی اور فوجی اہمیت ہے۔ ہم جس حد تک یہ تعلقات بڑھا سکیں گے اسی حد تک ہماری خارجہ پالیسی کامیاب ہوگی۔ جہاں تک بھارت کا تعلق ہے اس کی سرحدیں (ہمارے علاوہ) چین، برما اور نیپال سے ملتی ہیں۔ اس لئے ایسے موقع سے فائدہ اٹھانے کے سلسلے میں اس کی صلاحیت محدود ہے۔ خاص طور پر جبکہ عوامی جمہوریہ چین کے ساتھ اس کا سرحدی تنازعہ اب تک طے نہیں ہو سکا۔

مواصلات - ایک اور میدان جس میں پاکستان کو بھارت پر برتری حاصل ہے وہ بیرونی دنیا سے بحری اور فضائی ربط ہے۔ آنے والے سالہا سال تک دونوں ملک اپنی فوجی طاقت بڑھانے کے لئے صنعتی اعتبار سے ــــــــ زیادہ ترقی یافتہ ممالک پر بھروسہ کرنے پر مجبور ہیں۔ یہ مواصلاتی خطوط جنگ کے حالات سے ضرور متاثر ہوں گے۔ بھارت کو بیرونی ممالک سے ملانے والے بحری اور فضائی راستے اگرچہ پاکستان کے مغرب اور مشرق دونوں سمتوں میں کچھ فاصلے سے گزرتے ہیں۔ مگر پاکستان کے فوجی اڈوں کی زد سے باہر نہیں ہیں۔ اس کے خلاف پاکستان نسبتاً زیادہ آسانی سے مغربی ممالک سے مغربی پاکستان کے ذریعے اور مشرقی پاکستان سے مشرق میں واقع صنعتی طور پر ترقی یافتہ طاقتوں سے ربط قائم رکھ سکتا ہے۔ اور اس کے بیرونی مواصلات کو بھارتی فوجی اڈوں سے مزاحمت کا بہت ہی کم خطرہ ہے۔ اس سبب سے یہ مناسب ہے کہ مشرقی پاکستان کی دفاعی طاقت اس طرح بڑھائی جائے کہ فوجی ضروریات کے سلسلہ میں اس کو یورپ پر کم سے کم انحصار کرنا پڑے۔ یوں پاکستان کی انوکھی جغرافیائی صورت حال کو اس کی راہ میں دشواری سمجھنا درست نہیں ہے بلکہ اس کا انوکھاپن اس کی طاقت کا سبب ہو سکتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ ہم اپنے وسائل کا ذہانت سے استعمال کریں اور جنگ اور امن دونوں حالتوں میں ہماری قیادت

اور رہبری ہماری ضروریات سے ہم آہنگ ہو۔

دفاعی لحاظ سے پاکستان کی جغرافیائی پوزیشن اگر اسے کچھ سہولتیں عطا کرتی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس سلسلے میں پاکستان کو جن فوجی مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ معمولی ہیں۔ صنعتی طاقت اور فوجی سامان کے وسائل کے اعتبار سے بھارت کو جو برتری حاصل ہے اس کے باعث وہ پاکستان کی بہ نسبت کئی گنا زیادہ فوج رکھ سکتا ہے۔ اپنی زیادہ تعداد اور بہتر مادی وسائل کی بدولت وہ جنگ چھیڑنے اور فوجی کارروائیاں جاری رکھنے کی مقابلتاً زیادہ صلاحیت رکھتا ہے۔ لیکن جنگوں کا فیصلہ صرف مادی وسائل ہی نہیں کرتے بلکہ کچھ اور اسباب و عوامل بھی ان پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ جن میں سب سے اہم وہ عزم و استقلال اور جنگی مہارت ہے جس کے تحت کوئی قوم اپنے مادی اور انسانی وسائل کو استعمال کرتی ہے۔ پھر ان برتر قومی مساعی پر کئی اور باتیں بھی اثر انداز ہوتی ہیں۔ اس لئے جنگ میں کسی قوم کی حکمت عملی ایسی ہونی چاہیئے جو اس کی جبلت اور ذہانت کے مطابق ہو اور جس میں اس کے تمام قوی اور کمزور پہلوؤں کو یکساں مدِنظر رکھنا چاہیئے۔

پاکستان کی فوجی مشکلات میں ایک بڑی مشکل یہ بھی ہے کہ مغربی اور مشرقی پاکستان دونوں کی سرزمین میں جغرافیائی اعتبار سے وہ گہرائی

نہیں پائی جاتی جو جنگ میں بہت اہمیت رکھتی ہے۔ گہرائی کا مقصد ہے فاصلہ ۔ اور فاصلہ ایک دفاعی نظام کو جوابی کارروائی کے لئے جگہ اور وقت فراہم کرتا ہے۔ فضائی جنگ میں اس کا مطلب ان چند مزید لمحات کا میسر آنا ہے جو حملہ آور ہوائی جہازوں سے نپٹنے کے لئے انتہائی اہم ہوتے ہیں۔ تاکہ فضائی دفاع کو حرکت اور جواب کا موقع مل جائے اور دشمن کو زیادہ وسعت میں الجھاکر اس سے نبٹا جا سکے۔ اس میں کامیابی کے مواقع نسبتاً زیادہ ہوتے ہیں۔ اسی گہرائی کی بدولت زمین پر دفاع کرنے والوں کو بھی یہ موقع ملتا ہے کہ وہ موزوں عقبی علاقوں میں افواج کو صف آرا کر سکیں، مورچہ بندی کر سکیں اور عین سرحد ہی پر صف آرائی کے لئے مجبور نہ ہوں۔ چونکہ عام طور پر بین الاقوامی سرحدیں فوجی مصلحتوں کی رُو سے متعین نہیں ہوتیں۔ اس لئے بسا اوقات وہ دفاعی مورچوں اور صف آرائی کے لئے ناموزوں ثابت ہوتی ہیں۔

بری دفاع ۔ دفاع میں فاصلے کو کس حد تک کار آمد بنایا جا سکتا ہے، اس کا انحصار زیادہ تر زمین کی بناوٹ اور خصوصیات پر ہے۔ جس ملک میں پہاڑیاں اور ناہموار زمین ہو وہاں دفاعی مورچے کافی اگلے مقامات پر بھی قائم کئے جا سکتے ہیں اور وہاں فوج اپنا زیادہ علاقہ چھوڑنے پر مجبور نہیں ہوتی۔ مگر جن علاقوں میں ایسی قدرتی رکاوٹیں موجود نہ ہوں وہاں ایک

اچانک جارحانہ حملے کو ابتدا ہی میں روک دینا نسبتاً زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ حملہ آور دشمن عام طور پر یہ ظاہر نہیں کیا کرتا کہ وہ اصل حملہ کس علاقے میں کرے گا۔ شروع میں یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ کوئی کارروائی محض توجہ ہٹانے کے لئے ہے یا وہی اصل حملہ ہے۔ یہ تو جب واضح ہوتا ہے جب جنگ زور پکڑ جاتی ہے۔ اس لئے ہونا یہ چاہیئے کہ اصل دفاعی افواج سرحد سے کچھ پیچھے رکھی جائیں تاکہ دشمن کے عزائم سے باخبر ہونے کے بعد انھیں حسب ضرورت آگے بڑھایا جا سکے۔ اس وجہ سے ابتدائی مراحلِ دفاع میں کچھ علاقہ قربان بھی کرنا پڑتا ہے۔ تاہم یہ فیصلہ کرنے کے لئے کہ محکم دفاع کی تنظیم کے لئے کتنا علاقہ چھوڑا جائے متعدد عوامل کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

ان عوامل میں سے ایک تو اس علاقہ کی سیاسی اہمیت ہے جس کا اندازہ ان باشندوں کی تعداد سے کیا جاتا ہے جو اس سے متاثر ہو سکتے ہیں۔ پھر اس علاقہ کی صنعتی اور زراعتی اہمیت بھی غور طلب ہوتی ہے اور اس بات کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے کہ یہ علاقہ کھو دینے سے عوام کے جذبات اور حوصلوں پر کیا اثر پڑے گا۔ ان سب باتوں کا اندازہ بڑی احتیاط سے کرنا ہوتا ہے۔ کسی علاقے میں باشندوں کی تعداد اور صنعتی اور زراعتی اہمیت کا اندازہ صحیح طریقہ سے لگانا آسان ہے مگر یہ اندازہ لگانا نسبتاً دشوار

ہوتا ہے کہ اس علاقے کے چھن جانے سے قوم کی قوتِ دفاع پر کیا اثر پڑے گا۔ اگر عوام کو تھوڑا سا بھی اندازہ ہو کر ان کے ملک کی دفاعی صورت حال کیا ہے اور اس کی راہ میں کیا مشکلات ہیں تو بظاہر نامساعد حالات میں بھی ان کے حوصلے قائم رہ سکتے ہیں۔ عوام کے لئے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ اگر کچھ علاقے ہاتھ سے نکل جائیں لیکن ملک کی فوجی طاقت برقرار رہے تو ان علاقوں کا دوبارہ حصول ممکن ہے۔ اس کے برعکس اگر تھوڑے سے علاقے کو بچانے میں مسلّح افواج کی اصل طاقت ہی ضائع ہو جائے تو سمجھئے شکست ہو گئی اور نتیجتاً سارے کا سارا علاقہ ہاتھ سے نکل گیا۔

جنگ میں ملک کی مدافعانہ قوت کا تحفظ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ مسلّح افواج ہی علاقے حاصل کرتی یا ان کا دفاع کرتی ہیں۔ اس لئے جنگی استعداد کو برقرار رکھنا کسی مخصوص علاقے کے دفاع کی بہ نسبت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اگر کسی قوم کی ضرب لگانے والی طاقت برقرار رہے تو کھویا ہوا علاقہ واپس لیا جا سکتا ہے لیکن اگر ناقابل حل مشکلات کے باوجود کسی خاص قطعہ زمین کے دفاع کے لئے قوم کی قوتِ ضرب ہی ضائع کر دی جائے تو جنگ جاری رکھنے کی صلاحیت خطرناک حد تک متاثر ہو سکتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے لئے وطن کی زمین کا ہر گوشہ مقدس ہے لیکن اگر ہمیں مستحکم بنیادوں پہ دفاعی جنگ کرنی ہے تو خصوصاً ابتدائی

مراحل میں کچھ علاقوں کے دفاع کی بہ نسبت اپنی قوتِ ضرب کے تحفظ کو ترجیح دینی پڑے گی تاکہ اُسے کسی فیصلہ کن موقع پر استعمال کیا جا سکے —— قوم کو پاکستان کے سپاہیوں اور سالاروں کی فرض شناسی اور حب الوطنی پر پورا بھروسہ ہونا چاہیئے اور جان لینا چاہیئے کہ جب تک جنگی چالوں کی وجہ سے کوئی مجبوری پیش نہ آجائے وہ ملک کا چپہ بھر علاقہ بھی نہیں چھوڑیں گے۔ اور اپنی سابقہ روایات کے مطابق وطن کی عزت و ناموس کے لئے انتہائی بے جگری سے لڑیں گے۔ اگر کبھی انھوں نے کوئی علاقہ چھوڑا تو یہ فقط اس لئے ہوگا کہ جب حالات سازگار ہو جائیں تو وہ آگے بڑھ کر حملہ آور ہو کر کاری ضرب لگائیں اور کھویا ہوا علاقہ واپس لے لیں۔

جنگ کے زمانے میں کسی ملک کے تمام علاقوں کا یکساں قوت کے ساتھ دفاع اس قدر ناممکن ہوتا ہے کہ ایسی کوشش کرنا بھی تقاضائے دانش مندی نہیں ہو سکتا۔ کوئی ملک بھی اتنا طاقتور نہیں کہ وہ بیک وقت اپنی ساری سرحدوں کے ایک ایک انچ کا دفاع کر سکے۔ اس لئے کسی قوم کی جنگی فکر میں اس قسم کی باتیں لانا درست اور مناسب نہیں کہ " ہم ایک انچ علاقہ نہیں چھوڑیں گے۔" ایسی باتوں سے نہ صرف عوام غلط فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں بلکہ جن لوگوں کے دوش پر ملک کے دفاع کا بار ہے ان کا ذہن بھی ناگوار حد تک متاثر ہو سکتا ہے۔

فضائی دفاع۔ گہرائی یعنی جغرافیائی وسعت جس طرح بری دفاع کے لئے اہم ہے اسی طرح فضائی دفاع کے لئے بھی اہم ہے۔ اس سے ایک تو دفاعی نظام کو حملہ آور سے مقابلے کا کافی وقت مل جاتا ہے دوسرے طاقت کے ایک حصے کو حملہ آور کی زد سے دور منتقل کرنے کی مہلت بھی مل جاتی ہے۔ جدید راڈر بلند سطح پر پرواز کرنے والے ہوائی جہازوں کو تو ڈھائی تین سو میل کے فاصلے پر دیکھ لیتا ہے۔ لیکن پرواز کی سطح جتنی نیچی ہو گی یہ حد اتنی ہی کم ہوتی جائے گی۔ چونکہ مشرقی اور مغربی پاکستان کی اوسط چوڑائی تین سو میل سے زیادہ نہیں ہے اس لئے حریف کے جو راڈر سٹیشن ہماری سرحدوں کے قریب واقع ہیں وہ ہمارے علاقوں میں بلند سطح پر اڑنے والے جہازوں کا پتہ چلا سکتے ہیں اور نیچی سطح پر پرواز کرنے والے جہازوں کو اس سے کم مسافت میں دیکھ سکتے ہیں۔ یہ صورت حال ہماری فضائی کارروائیوں کو محدود کر کے ہمارا کام کسی حد تک اور مشکل بنا دیتی ہیں۔

جنگ بہر صورت ایک فن ہے اور فتح و شکست کا دارومدار بڑی حد تک اس کے اصولوں سے کماحقہ واقفیت اور اس سے بھی زیادہ ان اصولوں کے صحیح استعمال پر ہے۔ تاریخ بار بار یہ حقیقت ثابت کر چکی ہے اور آجکل کی جنگ بھی اس کی توثیق کرتی ہے کہ فتح کا انحصار جدید جنگی طاقت سے وابستہ کئے جانے والے عوامل سے کہیں زیادہ عزم و استقلال اور فنی مہارت پر ہوتا ہے " فنی مہارت

اور عزم و استقلال" کو جو اپنے دامن میں بہت سے تصوّرات کو سمیٹے ہوئے ہے، حاصل کرنا آسان نہیں. یہ خصوصیت جغرافیائی ماحول تاریخی اور ثقافتی روایات معاشری اور اقتصادی عوامل اور سب سے بڑھ کر قیادت اور قوم کے اجتماعی نصب العین اور احساسِ مقصدیت میں پروان چڑھتی ہے. اگر یہ سب عناصر صحیح مقدار میں موجود ہوں تو قوم اپنی بہت سی دشواریوں پر قابو پا سکتی ہے. ورنہ انتہائی مساعد حالات بھی اس کے لئے سود مند ثابت نہیں ہو سکتے.

قائد اور قیادت،

قیادت ایک ایسی صفت کا نام ہے جو دوسرے لوگوں کو تقلید اور پیروی پر خود بخود آمادہ کرتی ہے. اسی طرح قائد یا رہنما اس شخصیت کو کہتے ہیں. جس سے مشکلات اور ابتلا کے دور میں لوگ رجوع کرتے ہیں۔ اور رہنمائی کے سلسلے میں توقعات وابستہ کر لیتے ہیں. امن ہو یا جنگ، دونوں حالتوں میں قیادت قوم کے لئے یکساں اہمیت رکھتی ہے. لیکن جس طرح امن کے ایام میں اس وصف کی غیر موجودگی سے نا اہلیت پھیلنے کے علاوہ معاشری اور اقتصادی زوال رو بذیر ہو سکتا ہے اسی طرح جنگ کے زمانے میں قیادت کی عدم موجودگی تباہی اور ہلاکت کا باعث بن سکتی ہے

قیادت ایک ایسا وصف ہے جو یا تو فطرتی میں ملتا ہے یا پھر جدوجہد سے حاصل ہوتا ہے۔ اس پر تربیت اور گردوپیش کے حالات و واقعات بھی اثر ڈالتے ہیں۔ معاشرے کا اقتصادی اور معاشرتی ڈھانچہ، لوگوں کا عقیدہ و مذہب اور ان سب سے بڑھ کر عملی نمونہ اور مثال اس پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

رہنما زندگی کے ہر شعبے میں موجود ہوتے ہیں خواہ یہ مذہبی اکابر ہوں یا چوروں اور ڈاکوؤں کا کوئی گروہ ہو۔ حاکم ہو یا تاجر، عام سپاہی ہوں یا سالار، انتظامیہ کے عہدے دار ہوں یا معمولی کارکن غرض رہنما ہر کہیں اور ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ قائد کی شخصیت اپنی جماعت یا گروہ میں اتنی نمایاں اور ممتاز ہوتی ہے کہ دوسرے لوگ اس کی برتری اور عظمت کا اعتراف کرتے نظر آتے ہیں۔

یہ بات زیادہ اہمیت نہیں رکھتی کہ قائد اختیارات کا حامل ہے یا نہیں، سچا رہنما اور صحیح قائد کسی رتبے یا عہدے کا محتاج نہیں ہوتا۔ اور وہ اختیارات کے بغیر بھی نمایاں حیثیت کا حامل ہوتا ہے۔ اگر رسمی اختیارات بھی اس کے اعمال کو تقویت عطا کر رہے ہوں تو اپنے ساتھیوں اور رفیقوں میں اس کا اثر و رسوخ نسبتاً زیادہ ہوتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہمیشہ ایسا ہو۔ رہنما کا پیشہ اور کاروبار خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو،

کردار کے بعض اوصاف ایسے ہوتے ہیں جو وسیع پیمانے پر معاشرے کے نمائندہ عناصر میں عام طور پر نمایاں نظر آنے لگتے ہیں۔ اس کے علاوہ بعض دیگر اوصاف بھی ہیں جو اگرچہ زیادہ اہمیت نہیں رکھتے لیکن اس کے باوجود ایک انسان کو دوسروں کا قائد تسلیم کرانے اور رہنما بنانے میں ضرور مددگار اور معاون ثابت ہوتے ہیں۔

علم، راست بازی اور جرأت ۔ ایک قائد کے لئے اغلباً اہم ترین ضرورت علم ہے۔ وہ لوگوں میں صرف اسی صورت یقین و اعتماد پیدا کر سکتا ہے جب وہ فرائض منصبی کے متعلق مکمل معلومات رکھتا ہو۔ اگر وہ اپنے پیشے اور کام سے بخوبی واقف نہیں تو کوئی بھی برضا و رغبت اس کی پیروی اور تقلید پر آمادہ نہیں ہوگا۔ لیکن اگر وہ اپنے فرائض منصبی سے اچھی طرح باخبر ہے تو لوگ خود بخود اس کی طرف متوجہ ہو جائیں گے اور ان کے دلوں میں اس کے لئے عزّت و احترام کے جذبات پیدا ہونے لگیں گے۔ قیادت کی اس خصوصیّت کی ضرورت و اہمیّت ان حالات میں خاص طور پر بڑھ جاتی ہے جب تحفّظ و استحکام کا مسئلہ پیدا ہو جائے۔ اگر کبھی خطرے کی گھڑی اور مصیبت کی ساعت آن پہنچے تو لوگ صرف ایسے شخص کی پیروی کریں گے جس کے بارے میں وہ مطمئن ہوں کہ وہ اپنے فکر و عمل کی صلاحیتوں کی بدولت انھیں

ابتلاء کے دور سے سلامتی کے ساتھ نکال لے جائے گا۔

صحیح قائد وہی ہے جو راست باز اور قابلِ اعتماد ہو۔ راستبازی کے کئی معنی اور کئی تعبیریں ہو سکتی ہیں۔ لیکن اسے اگر وسیع معنوں میں لیا جائے تو اس کا مطلب وہ جوہر یا وصف ہے جو لوگوں میں یقین و اعتماد کی شمع روشن کرے۔ زندگی کے مختلف شعبوں میں لوگ اخلاق و کردار کے الگ الگ ضابطے اور معیار رکھتے ہیں۔ اگر کوئی رہنما ان اخلاقی معیاروں اور ضابطوں کا احترام نہیں کرتا یا انھیں نظر انداز کرتا ہے تو وہ لوگوں کی نظروں سے نہ صرف گر جاتا ہے بلکہ ان کا اعتماد بھی کھو بیٹھتا ہے۔ کردار کے یہ معیار ہمیشہ یکساں نہیں رہتے۔ بلکہ حالات کے اختلاف کے ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ تاہم ایک رہنما سے یہ توقع ہوتی ہے کہ وہ ان قدروں پر پورا اترے جو عام طور پر کسی معاشرے میں مروّج اور مقبول ہوں۔

اس کے علاوہ جرأت ایک اور وصف ہے جس کے بارے میں لوگوں کی پسند کے درجے کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہو وہ اسے عموماً قابلِ قدر جانتے ہیں۔ جرأت اخلاقی بھی ہو سکتی ہے اور جسمانی بھی لیکن دونوں قسموں کا راست بازی سے گہرا رشتہ اور تعلق ہے۔ صرف راستباز انسان ہی اخلاقی جرأت کا مظاہرہ کر سکتا ہے۔ حتیٰ کہ جسمانی جرأت بھی

عموماً انہی افراد میں پائی جاتی ہے جو راست بازی کے احساس سے پیدا ہونے والے کردار کے اصولوں کو عزیز رکھتے ہیں. لیکن جسمانی جرأت صرف نیکوکار اور صالح افراد ہی سے مخصوص نہیں کیونکہ بسا اوقات ایسے اشخاص نے بھی جرأت کے مظاہرے کئے ہیں جو احساس کمتری کا شکار تھے اور جن میں لالچ کے ساتھ بڑا بننے کی حد سے زیادہ خواہش موجزن تھی. حالانکہ یہ ادنیٰ درجہ کے لوگ تھے. جنھیں کسی طرح بھی راستباز انسان نہیں کہا جا سکتا. یہی وجہ ہے کہ اخلاقی جرأت ان دونوں اوصاف میں زیادہ بلند اور ممتاز درجہ رکھتی ہے. اخلاقی جرأت کا حامل انسان جسمانی جرأت اور شجاعت کا بالعموم مظاہرہ کیا کرتا ہے لیکن ضروری نہیں کہ ہمیشہ ہی ایسا ہو. عین ممکن ہے کہ جو شخص محض جسمانی جرأت کا مالک ہے وہ ذہنی دیانت اور اعتماد کی دولت سے یکسر محروم ہو. جن افراد میں یہ دونوں خوبیاں پائی جاتی ہیں. لوگ اکثر و بیشتر ان کو تعریف و تحسین کا مستحق سمجھتے ہیں اور ان کی راہ میں آنکھیں بچھانے کو تیار ہو جاتے ہیں. یہ اوصاف بڑے اہم ہیں یہی وجہ ہے کہ لوگ ہمیشہ ایسے افراد کی تلاش اور جستجو میں سرگرم رہتے ہیں جو ان اہم صفات سے بہرہ ور ہوں. کیونکہ قائدین کی عظمت انہی کی بدولت تسلیم کی جاتی ہے.

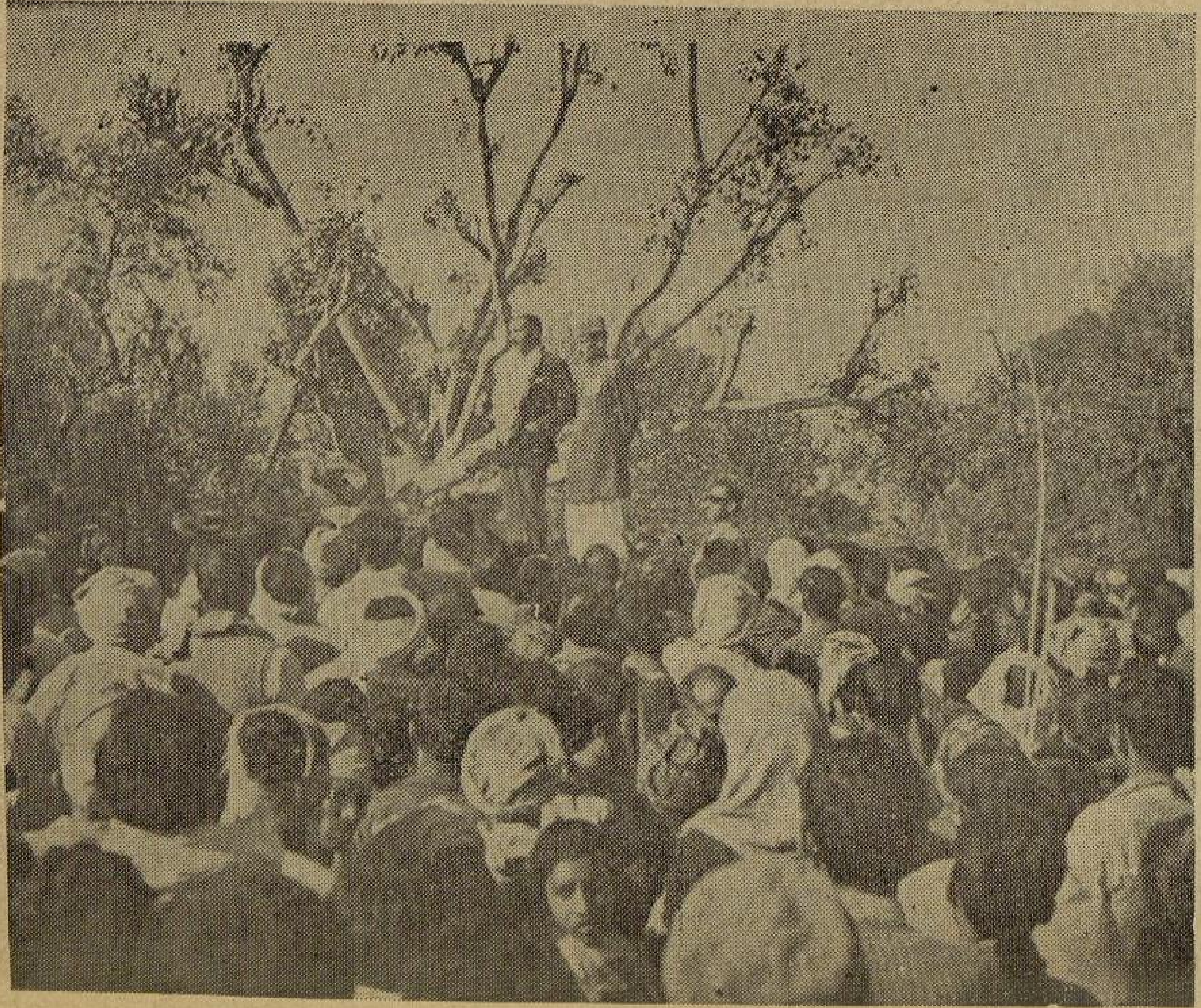
چونکہ رہبر کا فرض رہنمائی اور قیادت ہے اس لئے جو لوگ قیادت

کی تلاش میں ہوں ان کے لئے اس سے زیادہ مایوسی اور نامرادی کیا ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے قائد میں قوتِ فیصلہ کی کمی پائیں۔ کسی رہبر کا دائرہ اختیار جس قدر وسیع ہوتا ہے اسی قدر قیادت کی ضرورت اور اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ کوئی ادارہ جتنا بڑا، جس قدر پیچیدہ اور جس قدر اسکی ذمہ داریوں کا دائرہ وسیع ہوگا اسی قدر اور اسی نسبت سے رہبر کے لئے ضروری ہے کہ وہ رہنمائی کا فریضہ بخوبی سرانجام دے۔ کیونکہ یہی شئے اس کے وجود اور قیادت کی واحد وجہ جواز بن سکتی ہے۔ بسا اوقات اعلیٰ انتظامی عہدوں پر مامور اصحاب وصفِ قیادت اور جوہرِ رہنمائی سے محروم ہوتے ہیں جس کا نتیجہ مایوسی و نامرادی اور نا اہلیت کی صورت میں رونما ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے نااہل شخص کی ذمہ داریوں کا دائرہ اختیار جس قدر وسیع ہوگا اسی تناسب سے مایوسی اور بدنظمی میں اضافہ ہوتا جائیگا۔

معاشرتی کردار اور ذاتی چال چلن۔ کردار ایک اور وصف ہے جس کا کسی رہبر کی مقبولیت میں گہرا حصہ ہوتا ہے۔ کردار کے بھی مختلف لوگوں کے ہاں مختلف مفہوم ہیں۔ لیکن ہر معاشرے میں عام طور پر کچھ ایسے معیار رائج ہوتے ہیں جنھیں ہر شخص تسلیم کرتا ہے۔ قائد کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ ان معیاروں کو نظر انداز نہ کرے جو ان لوگوں میں مقبول ہیں جن کی قیادت اور رہنمائی کا وہ متمنی ہے۔ کسی شخص کا

معاشرتی کردار اور ذاتی چال چلن جس قدر بلند ہو گا اسی قدر وہ لوگوں کے لئے قابلِ قبول اور ہر دلعزیز ہو گا۔ جذبۂ ہمدردی ان اوصاف میں سرِ فہرست ہے جو کسی رہنما کے لئے ناگزیر تو بیشک نہیں مگر پسندیدہ ضرور ہیں اور جن سے اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ دوسروں کی فلاح و بہبود کی حقیقی آرزو خاص طور پر اپنے سے کم خوش نصیب افراد کی بہتری کے لئے پُر خلوص جذبہ بڑی قابلِ قدر شے ہے۔ اس کی بدولت عزت، احترام اور محبت کی وہ فضا پیدا ہوتی ہے جو ایک قائد کے لئے انتظام و انصرام کے علاوہ منزلِ مراد کی جانب رہنمائی کرنے میں معاون و سازگار ثابت ہو سکتی ہے۔ احساسِ مروّت اور جذبۂ ہمدردی میں خلوص کا ہونا لازمی ہے۔ کیونکہ لوگ قائد کے ہر کام اور ہر عمل سے بہت جلد اور بآسانی کھرے کھوٹے کا اندازہ کر لیتے ہیں۔

ان اوصاف میں سے بعض براہ راست نظر آجاتے ہیں اور بعض اس وقت نمایاں ہوتے ہیں جب دوسروں کے ساتھ ربط و تعلق قائم ہوتا ہے اور اظہارِ خیال کا موقع ملتا ہے۔ اس لئے یہ لازم ہے کہ قائد اتنی قابلیت اور اہلیت رکھتا ہو کہ وہ اپنے نظریات اور خیالات مؤثر اور دل نشیں انداز میں دوسروں تک پہنچا سکے۔ معقولیت، ذہانت منطقی استدلال اور اختصار و جامعیت سے بات کرنے کا سلیقہ



جہلم سے گوجرانوالہ آتے
ہوئے لالہ موسیٰ میں
سر راہ خطاب —
ایئر مارشل اپنی کار کی
چھت پر کھڑے ہیں —

چوہدری محمد اکرم
صدر تحریک جمہوریت
گجرات ساتھ ہیں -



مظفر آباد کے عوام قرآن حکیم کا نسخہ پیش کر رہے ہیں -

قیادت کی خصوصیات ہیں۔ پھر جس طرح لوگ اچھی تقریر سے متأثر ہوتے ہیں اسی طرح شکل وشباہت اور وجاہت سے بھی مسحور ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہ بات شک وشبہ سے بالا ہے کہ لوگوں پر قائد کی چال ڈھال اور وجیہہ شخصیت کا اثر پڑتا ہے۔ خاص طور پر جب لوگ اپنے لیڈروں کو قریب سے نہ دیکھ سکیں اور ان کی کمزوریوں اور خوبیوں کا صحیح اندازہ نہ لگا سکیں۔

انتخاب کی صلاحیت۔ یہ ہیں وہ چند خوبیاں اور اوصاف جن کا قیادت تقاضا کرتی ہے۔ ان کی اضافی اہمیت وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ معاشرے کی اقدار کے اوصاف سے (جو انسانوں کے باہمی تعلقات کو صدیوں سے متاثر کرتے چلے آئے ہیں) محروم ہوتے ہوئے بھی ایک صحت مند معاشرے میں قائد کی حیثیت سے ابھر سکے۔ تاہم قومی زندگی میں اخلاقی انحطاط کے وہ لمحات بھی آجاتے ہیں جب کلاہِ قیادت ہر سطح پر ایسے لوگوں کو میسر آجاتا ہے جو کسی طرح بھی ایک مہذب قوم کے معیار پر نہیں اترتے تاہم ان عارضی حالات سے مسلمہ اخلاقی اور معاشرتی معیار تبدیل نہیں ہو سکتے۔ ایسا زمانہ ہمیشہ آتا رہتا ہے جب "مقرر کردہ رہنما" ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں نااہل ثابت ہوتے ہیں جو ان کے کندھوں پر آپڑتی ہیں۔ یہ مسئلہ بیشتر انسانی اقدار سے زیادہ

موزوں انتخاب سے تعلق رکھتا ہے۔ اگرچہ کسی قائد کے اُبھرنے میں
اِس نوعیت کے انتخاب کو زیادہ دخل نہیں ہوتا۔ تاہم اس کی کامیابی و
کامرانی کے لئے لازم ہے کہ وہ موزوں ساتھی اور ماتحت چننے کی صلاحیت
رکھتا ہو۔ چونکہ یہ امر کامیابی سے ہمکنار کرنے میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔
اس لئے آئندہ مضمون میں ہم اس پر تفصیل سے بحث کریں گے۔

ایک رہنما کے اوصاف میں سب سے اہم وصف یہ ہے کہ وہ
کسی عہدے اور منصب کے لئے موزوں ترین آدمی چننے کی صلاحیت
سے بھی بہرہ ور ہو۔ اوّل خوبی کا حصول ہی سخت مشکل ہے تاہم میسّر
آجائے تو اسے برقرار رکھنا اور بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ عام طور پر یہ ایسی
شے نہیں جو ورثے میں مل جائے۔ اپنے اندر یہ خوبی پیدا کرنے کے
لئے بڑی حد تک ضروری ہوتا ہے کہ انسانی مزاج اور کردار کا مطالعہ
ہوشمندی سے کیا جائے۔ اقدار کا صحیح شعور حاصل کیا جائے۔ اعلیٰ درجے
کے ذہنی اور اخلاقی نظم و ضبط کو شعار بنایا جائے۔ اور راست بازی
کا جو بلند معیار دوسروں میں دیکھنے کی تمنّا ہو اس پر رہنما بطور انسان خود
بھی پورا اُترے۔ دوسرے لوگوں میں ان خوبیوں کی قدر وہی لوگ کر سکتے
ہیں جو خود بھی ان کے حامل ہوں۔ شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا ہے کہ جن لوگوں
نے اپنی ذات میں یہ خوبیاں پیدا کرنے کی زحمت نہ اٹھائی ہو وہ

دوسروں میں ان اوصاف کی قدر کر سکیں۔ انسانی کردار و اطوار کے عام اصولوں سے پتہ چلتا ہے کہ ایک ذہین، نیک اور ذی علم شخص اپنے ماتحتوں کا انتخاب کرتے وقت بالعموم ایسے آدمی چُننے گا جو کسی حد انہی صلاحیتوں کے مالک ہوں جو اس کے نزدیک، قابل قدر ہیں۔ اس کے برعکس جو شخص اہلیت اور راست بازی سے عاری ہو اس کے گرد و پیش ایسے لوگ جمع ہو جائیں گے جو اسی کی طرح نا اہل اور بد دیانت ہوں گے۔ اس کی وجہ عیاں ہے۔ ایک اہل آدمی اس وقت تک اپنی صلاحیتوں کو برقرار رکھ سکتا ہے جب تک وہ اہلیّت و قابلیت کا نمونۂ مثال پیش کرتا رہے اور کارگزاری میں بہترین نتائج سے کم تر پر کسی صورت میں مطمئن نہ ہو۔ وہ اسی صورت میں راست باز رہ سکتا ہے جب دوسروں سے اس کا اپنا معاملہ بھی پاک و صاف رہے۔ اس کا کوئی عمل اس کے ضمیر کی آواز کے خلاف نہ ہو۔ وہ بالعموم اپنے ارد گرد نا اہل اور بد دیانت افراد کو برداشت نہیں کرتا۔ اور جس قدر جلد موقع ملتا ہے ایسے لوگوں سے چھٹکارا پا لیتا ہے۔ اس کے برخلاف نا اہل شخص معاملات پر اس نقطۂ نظر سے نگاہ نہیں ڈالتا۔ اس کی قوتِ فیصلہ لازماً اس کی ذاتی اہلیّت اور راست بازی کے معیار سے متاثر ہوتی ہے۔ اگر وہ خود ان خوبیوں سے آراستہ نہیں تو بالعموم دوسروں سے بھی ان کی توقع نہیں رکھتا۔

بسا اوقات وہ اپنی خامیوں اور نقائص سے آگاہ ہوتا ہے اس لئے خوشامد، چاپلوسی اور کاسہ لیسی کو پسند کرتا ہے۔ ایسے شخص کے ماتحت اگر قابل اور لائق افراد ہوں تو انکی موجودگی میں اسکی گھبراہٹ اور بے چینی میں اور بھی اضافہ ہو جائیگا۔ وہ بیزاری محسوس کرے گا۔ بلکہ ماتحت اگر دیانتدار ہوں گے تو دیانت سے عاری شخص کی گھبراہٹ اور ایک ذہین اور باضمیر انسان کے دل میں اپنے نااہل افسر کے خلاف جو نفرت ہوتی ہے، اسے چھپانا آسان نہیں ہوتا نفرت کا یہ جذبہ کسی نہ کسی وقت ضرور ظاہر ہو کر رہتا ہے۔ ایسے آدمی کی موجودگی حاکم اعلیٰ کے لئے پریشانی کا موجب بن جائے گی۔ اور اسے کسی نہ کسی بہانے نکال دیا جائے گا۔ اگر اس کی قابلیت اور دیانت کا چرچا ہو تو اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے دوسرے بہانے تلاش کئے جائیں گے مثلاً اس پر "نافرمانی" "خودسری" "جذباتیت" اور "تندمزاجی" کے لیبل چسپاں کئے جائیں گے۔ اس نااہل حاکم کو صرف اس وقت سکون میسر آئے گا۔ جب وہ اپنے گرد اپنے ہی جیسے نااہلوں کا حلقہ قائم کر لے گا۔ تب اس حلقے میں اس کی حیثیت بطور ایک "سردار" اور "رہنما" کے مسلم ہو جائے گی۔ اس کو تمام علوم کا سرچشمہ سمجھا جائے گا اور اس کی ذات عزت و توقیر کا مرکز بن جائے گی۔ بظاہر ہر شخص اس کے سامنے عزت و احترام سے سرجھکائے گا

کم از کم اسے یہی نظر آئے گا اور وہ یہی کچھ محسوس کرے گا۔ یہ خود فریبی دراصل نا اہلیت کا خمیازہ ہے۔ ذہنی بددیانتی کی پیدا کی ہوئی مشکلات بھی اسی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔

جن لوگوں تک آزادیٔ اظہار کی روایت نہیں پہنچی اور جو حقیقی جمہوری اداروں سے محروم ہوتے ہیں وہ نسبتاً جلد خوشامد کی راہ پر چل نکلتے ہیں اور حق و صداقت کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ جمہوری روایات، اور حق و صداقت کی لذتوں سے آشنا ہوں اور ان کے تحفظ کے لئے کوشاں ہوں وہ اتنی آسانی سے خوشامد کو زندگی کا شیوہ نہیں بنا لیتے۔ خوشامد اور چاپلوسی ایک ایسی برائی ہے جو کسی قوم کے احساسِ خودداری اور خوئے راست بازی پر دوسری سماجی برائیوں کی نسبت زیادہ تیزی سے ڈاکہ ڈالتی ہے۔ ایک لیڈر کے لئے اس کے اثرات سے محفوظ رہنا بہت مشکل ہوتا ہے، جن ملکوں میں حالات ایسے ہوں وہاں خوشامد اور چاپلوسی اہلِ اقتدار کے گرد ایک حصار سا باندھ لیتی ہے۔ اسے ٹھکرانے اور اس کے اثرات سے بچنے کے لئے حد درجہ ذہنی بیداری، حقیقی انکسار اور کافی حد تک راست بازی کے اوصاف درکار ہیں۔ خوشامد لیڈر کی قوتِ فیصلہ اور نگاہِ انتخاب پر اثر ڈالتی ہے۔ جن لوگوں نے اس خطرناک مرض کے

مقابلے میں اعتدال و توازن قائم رکھا انھوں نے گویا نصف میدان مار لیا۔

حسنِ انتخاب۔ موزوں افراد کے انتخاب کے سلسلے میں عہدوں کے رد و بدل سے بھی ایک الجھن پیش آتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ بہت قابل آدمی سینئر بھی ہوں۔ چنانچہ موزوں اور قابل افراد کو سینئر عہدے داروں پر فوقیت دینے سے ایک ناخوشگوار صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس ردّ و بدل سے متاثر ہونے والے افراد برہم ہو جاتے ہیں۔ اور ان کی بے چینی دور کرنے کے لئے وضاحتوں کی ضرورت پیش آتی ہے۔ خاص طور پر جب حکام بالا سے منظوری لینی پڑے تو معاملہ اور بھی پیچیدہ صورت اختیار کر لیتا ہے تاہم جب بیرونی عوامل سے اثر لئے بغیر نہایت احتیاط اور ایمانداری سے کوئی فیصلہ کیا جائے تو بالعموم اس کا خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ ایسا فیصلہ نہ صرف فی نفسہٖ مستحسن ہونا چاہیئے بلکہ اسے واضح طور پر مستحسن نظر بھی آنا چاہیئے۔ یہ ضروری ہے کہ اس احتیاط سے کبھی کبھار کام لینے کی بجائے اسے ایک مستقل اصول کی حیثیت دے دی جائے۔ اس فیصلے سے جو شخص نظر انداز ہوتا ہے لازم ہے کہ اس کے کچھ ہمدرد بھی پیدا ہو جائیں گے لیکن اگر فیصلہ جائز اور منصفانہ ہو تو متاثرہ فرد اور اس کے بہی خواہ بھی بالآخر اسے جائز

اور منصفانہ محسوس کرنے لگیں گے۔ اس طرح لوگوں کے حوصلوں اور مورال پر کوئی ناگوار اثر نہیں پڑے گا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس سے صحت مندانہ اور خوشگوار اثرات مرتب ہوں گے۔ اس کے برعکس اگر یہ فیصلہ قابلیت اور اہلیت کی بجائے دوسرے اسباب پر مبنی ہوگا تو اس سے لوگوں کے حوصلوں پر تباہ کن اثرات پڑ سکتے ہیں۔

صحیح انتخاب کی صلاحیت یوں تو ہر شعبۂ زندگی کے رہنماؤں کے لئے ضروری ہے تاہم مسلح افواج میں اس کی اہمیت بالخصوص بڑھ جاتی ہے۔ یہ کہنا غلط نہیں کہ فوجی سالار کے لئے یہ منفرد خصوصیت بلاشبہ سب سے اہم ہے۔ منتخب بھی قابل اور لائق ماتحت چن لئے جائیں تو آدھا مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا۔ چونکہ بالائی سطح کے یہ چند قابل افراد اپنے اپنے ماتحت چنتے وقت بھی یہی معیار پیش نظر رکھیں گے، اس طرح یہ عمل ہر سطح پر دہرایا جائے گا۔ یہاں تک کہ بعض کمزوریوں کے باوجود مجموعی حیثیت سے ایک طاقتور فوج وجود میں آجائے گی۔ اس کے برعکس اگر چوٹی کا آدمی ہی نااہل ہو تو وہ اپنے گرد بھی ویسے ہی نااہل ماتحتوں کا ہجوم کر لے گا اور یہ سارا ڈھانچہ اس کی قوتِ فیصلہ اور شخصیت کا آئینہ دار ہوگا۔ غرض اس معاملے میں چوٹی کے آدمی کا حسنِ انتخاب کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ بظاہر تو یہ بڑی آسان سی بات نظر

آتی ہے لیکن درحقیقت ایک رہنما کے لئے یہ ایک کڑا امتحان اور کٹھن آزمائش ہے۔ یہ خوبی بڑی مشکل سے پیدا ہوتی ہے اس کا حصول جس قدر مشکل ہے اسی قدر اسے قائم رکھنا اور کام میں لانا دشوار ہوتا ہے۔ جب ایک رہنما میں انسانی فطرت کو پرکھنے کی صلاحیت، اعلیٰ اخلاقی دیانت، راست بازی، جرائت اور ایمان جیسے اوصاف موجود ہوں تو اس میں ناگزیر طور پر صحیح انتخاب کی صلاحیت بھی موجود ہوگی۔

راست بازی :

انسانی اقدار اگرچہ مستقل ہوتی ہیں لیکن ان کے بارے میں ایک فرد کا رجحان زمانے کے حالات اور گرد وپیش کے اثرات کی وجہ سے تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ تاہم بعض انسانی قدریں ایسی ہیں جن کو ہمیشہ بہت اہم سمجھا گیا ہے۔ ان قیمتی اوصاف میں سے ایک راست بازی ہے، دوست ہوں یا دشمن سب کے سب یکساں طور پر اس کی قدر کرتے ہیں۔ جرائت، ثابت قدمی، خوش خلقی، مہربانی اور ذہانت جیسے تمام اوصاف لوگوں کی نظر میں قابلِ قدر ہیں۔ لیکن ان سب میں راستبازی کو بلند ترین مقام حاصل ہے۔ لوگ اس وصف کو سب سے زیادہ عزت اور تحسین کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ یہ ایک ایسی خوبی ہے جو

انتہائی قابلِ قدر اور قابلِ تعریف ہونے کے باوجود لوگوں میں اتنا جوش اور ولولہ پیدا نہیں کرتی کہ وہ اپنی ذات میں اس جوہر کو پیدا کرنے اور نشو و نما دینے کے لئے جد و جہد کریں۔ راست بازی کی جڑیں بالعموم اخلاقی، مذہبی اور روحانی اعتقادات میں پیوست ہوتی ہیں۔ ان کی بنیاد ہمیشہ فرد کی زندگی کے ابتدائی برسوں کے سماجی اثرات اور بعض اوقات جذباتی تجربات پر ہوتی ہے جو اس کی شخصیت، دل و دماغ اور زاویۂ نظر پر گہرے اثرات چھوڑ جاتے ہیں۔ راست بازی کا جوہر بچپن کی تعلیم و تربیت، ماحول اور اس وصف کی حامل بڑی بڑی شخصیتوں کی سوانحِ حیات کے مطالعے سے نشو و نما پاتا ہے۔ تاہم یہ جوہر اس وقت زیادہ آسانی سے پروان چڑھتا ہے جب قومی زندگی کی بلند سطح پر قیادت کی زندہ مثالیں سامنے ہوں، اور راستبازی کے بلند اور اعلیٰ معیاروں کے نمونے ہر وقت پیشِ نظر ہوں۔ جب اس قسم کی بے مثال اور مایۂ ناز قیادت موجود ہو تو یہ ناممکن ہے کہ قوم کی اخلاقی حالت اور راست بازی کے معیار اس سے اثر قبول نہ کریں۔

غربت اور کردار۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اقتصادی عوامل لوگوں کے اخلاق و کردار پر اثر ڈالتے ہیں۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ جن کو مناسب خوراک اور لباس میسّر نہ آسکے ان سے دیانت داری کی

توقع فضول ہے۔ یہ درست ہے کہ اقتصادی عوامل اور مالی حالات ایک فرد کے رجحانات اور دوسرے لوگوں سے اس کے متعلقات کے سلسلے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ لیکن اسے کسی طرح بھی وہ واحد عنصر قرار نہیں دیا جاسکتا جو ایک فرد کے اخلاق پر اثر ڈالتا ہے اور نہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہی سب سے زیادہ اہم عنصر ہے۔ اگر حقیقت یہی ہوتی تو پھر دیانت داری اور راست بازی معاشرے کے ان افراد میں پائی جاتی جو مالی اعتبار سے اونچے اور اقتصادی لحاظ سے برتر ہوتے ہیں۔ دراصل ایسا نہیں بلکہ ہمارے معاشرے میں صورتِ حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ بدعنوانی خوش حال اور امیر لوگوں میں نسبتاً زیادہ پائی جاتی ہے۔ اس طبقے کے بیشتر لوگ اخلاقی پستی کا شکار ہو چکے ہیں۔ اور درحقیقت یہی وہ لوگ ہیں جو دیانت داری اور راست بازی کی صفات سے بالعموم محروم ہیں۔ ان کے مقابلہ میں ہمارے معاشرے کے غریب طبقے میں دیانت داری کا احساس اور راستبازی کا شعور نسبتاً زیادہ پایا جاتا ہے۔

چند تاریخی عوامل۔ اس خرابی کا اگر زیادہ گہرائی سے جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ راست بازی کے متعلق ہمارے عام رویے پر کئی دوسرے عوامل بھی اثر انداز ہوئے ہیں۔ ان میں سب سے اہم

ہمارا وہ روایتی طرزِ عمل ہے جو اقتدار اور حکومت کے متعلق پشتوں سے رائج ہے۔ برصغیر پاکستان و بھارت میں یہ رویہ صدیوں سے چلا آتا ہے۔ دنیا میں آپ کو ایسے خطے بہت کم ملیں گے جہاں غیر ملکی حملے اس کثرت اور تواتر سے ہوتے رہے ہوں جس کثرت سے گنگا اور سندھ کی وادیوں میں جاری رہے۔ اس طرح دنیا کے کسی ملک یا علاقے میں نسلوں کی اتنی قسمیں نہیں ملیں گی جتنی برصغیر پاک و بھارت میں پائی جاتی ہیں۔ حملوں کی کثرت کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں میں عدم تحفظ کا احساس پیدا ہوا جس کے نتیجہ میں حکومت کے متعلق ایک ایسے طرزِ عمل نے جنم لیا جو سرکشی و خوشامد اور بدگمانی و تعاون کے ایک عجیب و غریب امتزاج پر مبنی تھا۔ حکومت سے بے تعلقی، بیگانگی اور سرد مہری کا یہ طرزِ عمل اگرچہ ہند میں مسلمانوں کی حکمرانی کے آغاز کے ساتھ ماند پڑنے لگا لیکن بالکل ختم نہ ہوا۔

اس برصغیر میں اسلام کی اشاعت سے اس مذہب کے واضح اور متعین اصولوں کی بدولت اس خطے کے باشندوں کو پہلی بار ایک ایسا ضابطۂ اخلاق میسر آیا جو نہایت سادہ اور قابلِ فہم تھا۔ تاہم حکومت سے دوری اور بیگانگی کا رویہ بدستور باقی رہا۔ اور ریاست کے متعلق خود غرضی پر مبنی نقطۂ نظر جاری رہا۔ یہ رجحان برطانوی راج میں اور بھی بڑھ

گیا۔ حکمران اور عوام کے درمیان تعاون اور شرکت کا جو تھوڑا بہت احساس موجود تھا وہ بھی جاتا رہا۔ حکومت کے متعلق عوام کا رویہ بے اعتباری اور بدگمانی پر مبنی تھا بلکہ بسا اوقات اس کی سرحدیں دشمنی سے جا ملتی تھیں۔ مسلمانوں میں یہ احساس بالخصوص زیادہ شدت سے موجود تھا، کیونکہ وہ اپنے آپ کو ہند کے جائز حکمران تصور کرتے تھے۔ اس رویے اور طرزِ عمل نے حکومت کے ساتھ عدم تعاون کے جذبے کو فروغ دیا جو آج تک جاری و ساری ہے۔ حکومت کو چونکہ بیگانہ اور غیر سمجھا جاتا اس لئے اسے فریب یا دھوکا دینا کوئی برا یا غیر اخلاقی فعل شمار نہیں ہوتا تھا۔ معاشرے کے خوش حال اور اہلِ ثروت افراد حکومت کی پیداوار خیال کئے جاتے اور اس کا کسی حد تک جواز بھی موجود تھا۔ حکومت اور ان عناصر کے درمیان امتیاز مٹ گیا۔ ایسی صورتِ حال میں ہر بات درست اور ہر شے جائز سمجھی جانے لگی۔ چنانچہ ایک ایسی فضا پیدا ہو گئی جس میں کوئی زیادہ مضبوط اور مؤثر عنصر ہی لوگوں کو راہِ راست پر قائم رکھ سکتا تھا۔ یہ مؤثر ترین طاقت صرف مذہب ہی تھا جس کے باعث اخلاقی زوال کی رفتار رُکی رہی۔

حرص اور اخلاق۔ ملک میں صنعتی ترقی، وہیں معاشرے میں بڑھتے ہوئے شہری ماحول اور رنگ، زندگی میں تیز رفتاری اور والدین کی

جانب سے بچوں کی تربیت اور رہنمائی میں غفلت جیسے عوامل نے باہم مل کر ہماری نوخیز نسلوں میں اخلاقی معیار کو پست کرنے میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ اشیائے صرف اور اشیائے تعیش کے استعمال میں حیرت انگیز اضافہ ہوا ہے جس نے سادگی، قناعت پسندی اور پرہیزگاری جیسے اوصاف کو بے پایاں متاثر کیا ہے۔ چنانچہ پاکیزگی و پاک بازی کے اس نظریئے کو سخت نقصان پہنچا ہے جو اسلامی معاشرے کے ابتدائی سنہری دور میں اس کا امتیازی نشان تھا۔ حرص اور طمع ایسی خصوصیت ہے جو ہمارے موجودہ معاشرے کے بناوٹ پسند طبقے میں غالباً سب سے زیادہ حاوی ہے۔ لالچ اور طمع جب مناسب حدوں سے بڑھ جائیں تو راست بازی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ چونکہ یہ دونوں بنیادی طور پر متضاد اور مخالف خصوصیات ہیں اس لیے اگر لالچ کی روک تھام نہ کی جائے اور اسے بڑھنے پھیلنے کی کھلی اجازت دے دی جائے تو راست بازی کو یقیناً زبردست نقصان پہنچے گا۔

راست بازی کے اوصاف۔ تاہم راست بازی کے مادی اور مالی پہلوؤں کے مقابلے میں دوسرے پہلو زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ راست باز انسان ہی صاحب کردار ہوتا ہے۔ سیرت و کردار کا دائرہ اختیار مادی لین دین اور اقتصادی معاملات کے مقابلے میں یقینی طور پر

وسیع تر ہوتا ہے۔ راست باز انسان وہ ہے جس پر اعتماد اور بھروسہ کیا جا سکے اور جو کسی معاوضے یا انعام کی خواہش کے بغیر صحیح اور درست کام سر انجام دیتا ہے۔ یہ راست باز انسان کا ہی خاصہ ہے کہ درست اور جائز کام کی انجام دہی اس کے لئے مادی فوائد یا بڑے بڑے انعام کے مقابلے میں زیادہ باعثِ اطمینان ہوتی ہے۔ اس کے برعکس، مادی اور مالی فوائد کمتر اور ادنیٰ درجے کے انسانوں کو مسحور کر لیتے ہیں۔ راست باز اور دیانت دار انسان اپنے نظریات و خیالات کو کسی خوف و ہراس کے بغیر بیباکی، جرائت مندی اور دیانت داری سے کھلم کھلا بیان کرے گا۔ وہ خطرات سے پُر مگر سیدھے راستے کو چھوڑ کر آرام دہ اور بے خطر راہ کی ترغیب سے کوئی اثر قبول نہیں کرے گا۔ خوش حالی کا راستہ۔ حقیقت یہ ہے کہ آسان راستہ عموماً انسان کو کامیابی کی طرف نہیں لے جاتا۔ اگر خوشحالی کا مطلب صرف زندگی میں کامیابی ہے تو ایک باضمیر انسان اس وقت تک خوش نہیں ہو سکتا جب تک وہ عزتِ نفس اور خودداری کا قدردان ہے اور سارے دن کا کام مکمل کرنے کے بعد وہ سچائی کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا کہ اُس نے اپنے معاملات گفتار اور کردار میں دیانت داری برتی ہے۔ جب تک اس کا اپنا ضمیر مطمئن نہیں اور وہ اس کے حق میں گواہی نہیں دیتا وہ خوشی

اور مسرت کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ بلند مرتبے، اختیار اور طاقت سے خوشحالی نصیب ہو سکتی ہے انھیں یہ بات اچھی طرح یاد رکھنی چاہیئے کہ کوئی شخص بھی لوگوں کے دلوں اور ذہنوں میں عزت و احترام کا مقام حاصل نہیں کر سکتا تا وقتیکہ لوگ اس کی راست بازی اور اعلیٰ کردار کی بنا پر اس کا احترام نہ کرتے ہوں شہرت دوام اس وقت قائم رہ سکتی ہے جب چند دائمی صفات اور ابدی خوبیاں اسے قوت و طاقت عطا کریں۔ سیرت و کردار کے مقابلہ میں کسی اور خوبی کی کوئی حیثیت یا وقعت نہیں اس کے بغیر اپنے اور دوست کی قدر و قیمت بالکل عارضی ہے جو کسی انسان کے لئے وجہ اطمینان نہیں ہو سکتی۔

دولت مندوں کے لئے قابلِ رشک ۔ ہمارے معاشرے کے بیشتر غریب اور بے نوا افراد آج تک بعض اعلیٰ اوصاف کے حامل ہیں جن پر دولتمندوں کو رشک کرنا چاہیئے۔ سادہ زندگی اور ضابطہ کردار کی مضبوط جڑیں مذہب کے ساتھ پیوستہ ہیں اور اس کے ماننے والوں میں مقبول ہیں۔ لالچ اور بناوٹ سے بیگانگی انھیں حق و صداقت کے قریب رکھتی ہے۔ ہمارے معاشرے کے انحطاط اور زوال کا خاتمہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب راست بازی اور کردار صرف غریب لوگوں کے لئے ہی مخصوص

نہ رہے۔ کیونکہ آخر وہ کب تک ان اوصاف پر عمل پیرا رہیں گے۔ ایک نہ ایک دن وہ وقت آئے گا جب ان پر راست بازی اور دیانت کی گرفت ڈھیلی پڑ جائے گی اور ان کی امنگیں دم توڑ جائیں گی۔ وہ لوگ جو ہماری قومی زندگی کے تمام شعبوں میں اقتدار واختیار کے مالک ہیں ان کے لیے یہ بات بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ وہ اس قسم کا طرزِ عمل اختیار کریں جس سے خواہ انھیں مالی اور اقتصادی مفادات نہ بھی حاصل ہوں لیکن صحیح مسرت اور ابدی احترام نصیب ہو سکے۔ شرط یہ ہے کہ وہ لوگ معاملات اور واقعات کو ان کے صحیح پس منظر میں دیکھنا شروع کر دیں۔

سپاہی اور سیاست

یہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کے مبارک دن کا ذکر ہے۔ جب پاکستان کے پہلے گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناح گورنمنٹ ہاؤس کراچی میں میزبانی کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ انھوں نے مہمانوں کی کثیر تعداد کو اپنے ہاں دعوت دے رکھی تھی۔ اپنے ہزاروں مہمانوں کے درمیان قائداعظم بڑی آزادی سے چل پھر رہے تھے۔ مہمانوں میں شہری اور فوجی حکام دونوں شامل تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں اور

مرد بھی۔ قائدِ اعظمؒ کی شخصیت ہمیشہ بڑی دلکش، بارعب، منفرد اور یکتا نظر آتی تھی۔ آج وہ غور و فکر کے عالم میں تھے۔ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے قتلِ عام کی خبریں آنی شروع ہو گئی تھیں۔ اس سے ان لوگوں کے جذبات کافی مجروح ہوئے جو آج یہاں ایک عظیم الشان تقریب منانے کے لئے جمع ہوئے تھے۔ تاہم ان لوگوں کے دلوں میں اس تاریخی واقعہ کی اہمیت کم نہ ہوئی تھی۔ جن کو خوش قسمتی سے اس یادگار تقریب میں شامل ہونے کی سعادت میسّر آئی تھی۔

قائدِ اعظمؒ چلتے چلتے فوجی وردی میں ملبوس افسروں کی جماعت کے قریب آنکلے۔ وہ ابھی اس گروہ کے قریب پہنچنے بھی نہ پائے تھے کہ یہ نوجوان افسران کے گرد جمع ہو گئے۔ یہ لوگ قائدِ اعظم کی فکر افروز باتیں سننے کے بہت مشتاق نظر آتے تھے۔ قائدِ اعظم کو شاید یہ پہلا موقع میسّر آیا تھا کہ وہ فوجی افسروں سے ملاقات کر رہے تھے۔ اس لئے اُنھوں نے اپنے گرد جمع فوجی جوانوں میں معمول سے زیادہ دلچسپی کا اظہار کیا۔ یہ صرف قائدِ اعظم کے لئے ہی پہلا موقع نہ تھا بلکہ فوجی افسروں کی کثیر تعداد بھی آج پہلی بار ایک ممتاز اور بلند شخصیت اور قومی رہنما کے روبرو کھڑی تھی۔ ان حکام کو پہلی بار یہ موقع نصیب ہوا کہ وہ ان مسائل کے بارے میں اس قومی شخصیت کے خیالات براہِ راست سُن سکیں جو

عرصے سے اُن کے ذہنوں میں موجود تھے۔ قائدِ اعظم تخلیقِ پاکستان کی سیاسی جدوجہد میں اس قدر مصروف تھے کہ وہ قومی اہمیت کے حامل ضروری مسائل اور امور کو چھوڑ کر مسلح افواج کے لئے وقت نہ نکال سکتے تھے۔ سیاسی اعتبار سے یہ بات پسندیدہ نہیں تھی کہ وہ فوجی حکام سے ملیں اور حکمت عملی کے معاملات پر بات چیت کریں تاوقتیکہ نئی ریاست وجود میں نہ آجائے۔

آزادی کا مقصد۔ قائدِ اعظم نے عام موضوعات پر مختصر سی باتیں کیں۔ اپنی گفتگو کے دوران میں وہ چھوٹے چھوٹے جملے استعمال کرتے رہے، جب بات چیت کا رنگ ذرا پھیکا پڑنے لگا تو وہ بعض دوسرے مہمانوں کی طرف متوجہ ہوتے دکھائی دیے۔ عین اسی وقت اس گروہ کے ایک اعلیٰ فوجی افسر نے بعض قومی اہمیت کے معاملات پر گفتگو کرنے کی اجازت چاہی۔ اب تک بیشتر باتیں چونکہ قائدِ اعظم ہی کرتے رہے تھے غالباً اس لئے انھوں نے جب یہ دیکھا کہ کوئی دوسرا شخص بھی کچھ کہنے کا خواہش مند ہے تو وہ خوش ہوئے اور اپنا سر ہلاتے ہوئے رضامندی کا اظہار کیا۔ وہ افسر جو پہلے ہی اس موقع کا منتظر تھا بول اٹھا "ہمارے لئے آج کا دن بڑی اہمیت اور عظمت رکھتا ہے۔ ہم مسلح افواج کے افراد کو بھی اس دن پر اتنا ہی فخر ہے جتنا دوسرے شہریوں کو جو آپ

کی قیادت میں اس یوم سعید کے حصول کے لئے کوشاں رہے۔ یہ حقیقت ہے کہ پاکستان لوگوں کی تمناؤں اور خوابوں کی تعبیر ہے اور عوام کی آرزوؤں اور جذبات کی تکمیل کے لئے اسے وجود میں لایا گیا۔"

قائدِ اعظم جس لمحے اس گروہ میں آ کر شامل ہوئے اس کے بعد پہلی مرتبہ وہ گفتگو میں زیادہ دلچسپی لیتے ہوئے نظر آئے۔ ان کی آنکھوں میں ذوق و شوق کی چمک جھلکنے لگی۔ اور وہ یہ سننے کے لئے منتظر تھے کہ یہ نوجوان اب کیا کہتا ہے۔ وہ پوری طرح متوجہ تھے اور اس نوجوان افسر کی گفتگو میں مکمل دلچسپی ظاہر کر رہے تھے۔ اس نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "ریاست کے معرضِ وجود میں لانے کا ایک مقصد ہمیں یہ موقع مہیا کرنا تھا کہ ہم اُسے اپنی خاص ضروریات، عقائد اور صلاحیتوں کے مطابق ڈھال سکیں۔ ہمارے لوگوں میں مخفی صلاحیتیں موجود ہیں اور اب انھیں بڑھنے پھولنے اور بروئے کار لانے کی اجازت ہونی چاہیئے۔"

قائدِ اعظم کی دلچسپی میں لحظہ بہ لحظہ اضافہ ہو رہا تھا۔ اور وہ پوری توجہ سے سُن رہے تھے۔ نوجوان افسر جو اپنے خیالات کا اظہار کر رہا تھا اُس نے نہ صرف اس عظیم رہنما کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی بلکہ دوسرے سامعین نے بھی اس کی طرف کان لگا رکھے تھے۔ وہ کہتے لگا "ہم دیکھ رہے ہیں کہ جن اعلیٰ عہدوں پر ہم اپنی فطری اور پیدائشی صلاحیتوں کو استعمال

کر کے ملک کے لئے زیادہ مفید اور کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں وہی عہدے ماضی کی روایات کے مطابق غیر ملکیوں کے حوالے کئے جا رہے ہیں۔ تینوں مسلح افواج کے سربراہوں کے عہدے اور دوسری اعلیٰ ترین کلیدی اسامیاں انگریزوں کے سپرد کر دی گئی ہیں۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر پاکستان کیسے چلے گا؟"

اعتدال کا راستہ ۔ قائدِ اعظم نے بڑے اطمینان کے ساتھ اپنی انگلی بلند کرتے ہوئے فرمایا "مت بھولئے کہ آپ مسلح افواج کے لوگ عوام کے خادم ہیں۔ قومی پالیسی کو آپ وضع نہیں کرتے۔ یہ ہم شہریوں کا حق ہے کہ ہم تمام مسائل کے متعلق فیصلے کریں۔ اور یہ آپ کا فرض ہے کہ ان فیصلوں کو عملی جامہ پہنائیں اور ان کاموں پر عملدرآمد کریں جو آپ کے سپرد کئے جائیں۔ اسلام کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ مسلمان یا تو آسمان کی بلندیوں تک پرواز کرتے رہے یا پھر زمین کی پستیوں اور گہرائیوں میں جا گرے ہیں۔ شاذ و نادر ہی ایسا ہوا ہے کہ ہم نے اعتدال و توازن سے کام لیا ہو۔ ہم انتہا پسند قوم ہیں۔ اگر پاکستانیوں کو ایک عظیم قوم بننا ہے تو ہمیں اعتدال کی راہ اختیار کرنا ہو گی۔ خیالات میں بھی اعتدال ہو اور اعمال میں بھی اعتدال ہو۔ باہمی معاملات میں اعتدال کی روش پر چلیں اور بین الاقوامی تعلقات میں

بھی اعتدال کے مسلک کو اپنائیں۔" وہ یہ کہہ کر مسکراتے ہوئے اس گروہ سے رخصت ہوئے اور دوسرے مہمانوں کو خوش آمدید کہنے تشریف لے گئے۔

فوجی افسروں کے اس گروہ میں شامل ہونے کی وجہ سے راقم کو قائدِ اعظم کی باتیں ان کی زبانی سننے کی سعادت نصیب ہوئی۔ اُن کے خیالات پر اکثر غور و فکر کیا۔ چنانچہ میں نے ان کے الفاظ کی روشنی میں یہ سمجھنے کی کوشش کی کہ ہمارے اس انتہا پسندانہ طرزِ عمل اور رویے کی تعمیر میں اسلام کا کتنا حصہ ہے اور دوسرے جغرافیائی اور نسلی عوامل نے مسلمانوں کے مزاج اور کردار کو کس حد تک متاثر کیا ہے۔ ہمارے عمل کے خواہ کچھ بھی اسباب کیوں نہ ہوں۔ تمام پاکستانیوں کو قائدِ اعظمؒ کے ارشادات کو اچھی طرح یاد رکھنا چاہیئے۔

فوج اور سیاست کا تعلق۔ مسلح افواج کی تربیت میں چونکہ کارکردگی اور کیفیت، موزونیت، تیز رفتاری، راست بازی اور اس قسم کے دوسرے اوصاف کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے اس لئے جنھیں اپنی قوم کی معاشرتی تعمیر میں ان خوبیوں کی کمی نظر آتی ہے وہ شہری امور اور معاملات میں دخل دینے کی بالعموم ضرورت محسوس کرنے لگتے ہیں۔ ان حالات میں یہ بات یاد رکھنا چاہیئے کہ بنیادی طور پر اقتصادی اور

معاشرتی مسائل عموماً فوجی حل کے ذریعے انجام نہیں دیئے جا سکتے۔ سیاسی مسائل کے لئے سیاسی حل ہی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ملک کے مفادات کا بھی یہی تقاضا ہے کہ مسلح افواج ملک کی سرحدوں کی حفاظت اور استحکام پر مامور رہیں۔ جو ان کا سب سے بڑا اہم اور اصل فریضہ ہے۔

اتحادِ عالمِ اسلامی اور پاکستان

مسلح افواج حکومت کی پالیسی پر عمل کرتی ہیں۔ کسی ملک کے دفاعی سانچے پر غور کرتے وقت اُس کے قومی نصب العین اور اُس کے نظریاتی و سیاسی اغراض و مقاصد کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ پاکستان محض اس لئے وجود میں لایا گیا تاکہ برصغیر کے مسلمانوں کے لئے ایک الگ وطن قائم کیا جائے۔ اسلام اور صرف اسلام ہی اس کا محرک تھا اور یہی وہ مضبوط رشتہ ہے جو آئندہ چل کر اہلِ پاکستان کا قومی اتحاد برقرار رکھ سکتا ہے۔ اگر اسلام ہی وہ قوت ہے جس کی بدولت پاکستان بنا اور اگر یہی قوت اسے برقرار اور متحد رکھنے کی ضامن ہے تو اسے بین الاقوامی سیاست کے میدان میں بھی پاکستان کے فکر و عمل پر اثر انداز ہونا چاہیئے۔ گزشتہ بیس سال کی تاریخ بھی یہی ظاہر کرتی ہے کہ پاکستان کے بین الاقوامی تعلقات

میں اسلام ایک مستقل عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔

قیام پاکستان کے بعد ابتدائی چند سال تک پاکستان دنیا کے دو بڑے بلاکوں کے درمیان غیر جانبداری کی پالیسی پر گامزن رہا۔ لیکن اس کے بعد امریکہ اور اس کے مغربی اتحادیوں کے ساتھ ایک معاہدے میں شریک ہو گیا۔ پھر ۱۹۶۰ء کے بعد اس کی پالیسی میں تبدیلی شروع ہوئی حتیٰ کہ چین کے ساتھ تعلقات اعتدال پر آ گئے جس کا امریکہ کے ساتھ تعلقات پر اثر پڑا۔ ۱۹۶۵ء کے بعد پاکستان کی خارجہ پالیسی کا رُخ پھر اس جانب مڑ گیا جس پر آج سے بیس سال قبل ہم کاربند تھے۔ یعنی روس کے ساتھ تعلقات بہتر ہو جانے سے پاکستان غیر جانبداری کی اس پالیسی کے قریب آ گیا جو اس نے ۱۹۴۷ء میں آزادی کے بعد چند سال تک بین الاقوامی میدان میں برقرار رکھی تھی۔ ہلچل کے اس سارے دور میں پاکستان ضرورت کے مطابق اپنی بین الاقوامی پوزیشن بدلتا رہا۔ تاہم اسلامی دنیا کے بارے میں وہ مستقل طور پر ایک ہی نقطۂ نظر پر قائم رہا۔ اور صرف افغانستان کے سوا باقی تمام مسلمان ممالک کے ساتھ اس کے تعلقات خوشگوار رہے۔ عرب دنیا کی باہمی کشمکش کے باوجود جو بعض اوقات شدید نوعیت اختیار کرتی رہی، ان مسلم ہمسایہ ملکوں کے متعلق پاکستان کے بنیادی نقطۂ نظر میں

کوئی تبدیلی آئی اور نہ ان ممالک کی نظروں میں پاکستان کے رتبہ و مقام پر کوئی اثر پڑا۔ اب جبکہ پاکستان اپنی تاریخ کے دوسرے دس سال پورے کر چکا ہے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ داخلی و خارجی حالات میں اتار چڑھاؤ کے باوجود دنیائے اسلام میں اس کی مستقل اور پائیدار دلچسپی بین الاقوامی تعلقات میں اس کے فکر و عمل پر حاوی رہے گی۔ اس لیے یہ لازم ہے کہ ملک کے دفاعی تصوّر میں بھی اس بین الاقوامی زاویہ نگاہ کو پیشِ نظر رکھا جائے۔

فوجی اور جغرافیائی اہمیت۔ مراکش سے لے کر پاکستان اور انڈونیشیا تک سارے علاقے کو فوجی اور جغرافیائی اعتبار سے بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس خطے کے ممالک نہ صرف مشرق و مغرب کے درمیان واقع سمندری اور فضائی راستوں پر قابض ہیں بلکہ ایسے بے پناہ قدرتی وسائل کے مالک بھی ہیں جو فوجی اعتبار سے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ افرادی قوت اور مادی وسائل کے لحاظ سے بھی ان میں اس قدر صلاحیت پوشیدہ ہے کہ وہ دنیا کے طاقت ور ترین ممالک کا مقابلہ کر سکیں۔ بیرونی اعتبار سے دیکھا جائے تو مستقبل قریب میں ان ممالک کے تحفظ اور بقا کو اسرائیل اور بھارت سے شدید فوجی خطرہ پیش آسکتا ہے۔ اسرائیل کے معاملے میں تمام مسلمان ممالک

باہم متفق و متحد ہیں اور اس مسئلے پر ان کے درمیان کوئی خاص اختلاف موجود نہیں۔ اگرچہ تاریخی اعتبار سے بھارت دنیا بھر کے مسلمانوں کے لئے کبھی زیادہ خطرناک نہیں رہا۔ لیکن موجودہ حالات میں وہ کم از کم ایک مسلمان ملک یعنی پاکستان کی بقا کے لئے ہر لحاظ سے مستقل خطرہ ثابت ہو رہا ہے۔ چونکہ دوسرے اسلامی ممالک اس خطرے سے دُور واقع ہونے کی وجہ سے بظاہر اس خطرے سے محفوظ ہیں اس لئے انھیں ابھی بھارت کی خطرناک فوجی اور سیاسی اہمیت کا اس قدر احساس نہیں ہوا جس قدر ہونا چاہیئے تھا۔ تاہم ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ کے باعث عالم اسلام میں بہت حد تک اتفاق اور اتحاد کی لہر دوڑ گئی تھی۔ دو ہفتے کی مختصر مدت میں پہلی بار اسلامی ممالک کے درمیان ایک ایسے مسئلے پر اتحاد ہوا جس سے بظاہر ان کے اپنے مفادات پر کم از کم مستقبل قریب میں کوئی زد نہیں پڑتی تھی۔ اس خطے کے دونوں سروں پر واقع ممالک ترکیہ اور ملائشیا کے اپنے اپنے انفرادی مسائل بھی کشمکش کا باعث بن سکتے ہیں کیونکہ ترکیہ کا یونان سے، ملائشیا کا فلپائن سے تنازعہ موجود ہے۔ ان دونوں معاملات کے بارے میں اسلامی ممالک کے درمیان کسی حقیقی اختلاف کا امکان نہیں۔

طاقتور دھڑے اور ہمارا رویہ۔ دنیا کے دونوں بڑے بلاکوں سے

تعلقات کے سلسلے میں دنیائے اسلام میں کوئی شدید اختلاف نہیں۔ ترکیہ ایران اور پاکستان کے سوا باقی تمام اسلامی ممالک فوجی معاہدوں کے ذریعے کسی بلاک یا دھڑے کے ساتھ وابستہ نہیں ہوئے حتیٰ کہ اب ترکیہ، ایران اور پاکستان بھی فوجی اور سیاسی تعلقات کے لحاظ سے امریکہ سے زیادہ قریب نہیں رہے اور امریکہ سے ان کے روابط میں اب پہلے کی سی گرمجوشی نہیں رہی۔ ایک طرف ترکیہ اور ایران کے باہمی تعلقات اور دوسری طرف ان کے روس کے ساتھ قائم ہونے والے روابط نے دونوں ملکوں کے بین الاقوامی زاویہ نگاہ پر اثر ڈالا ہے۔ جس قدر یہ دونوں ملک فوجی ضروریات کے لئے صرف امریکہ پر انحصار کی پالیسی سے دور ہٹتے جائیں گے اسی قدر دونوں بلاکوں کے درمیان ان کی غیر جانب داری کی پوزیشن واضح ہوتی جائے گی اور اسی نسبت سے یہ دوسرے اسلامی ممالک سے قریب تر ہوتے جائیں گے۔ پاکستان اگرچہ ابھی تک دو فوجی معاہدوں میں شریک ہے تاہم اس نے مغربی بلاک سے پیچھے ہٹنے میں ترکیہ اور ایران کی بہ نسبت زیادہ تیزی دکھائی ہے یہاں تک کہ وہ ان معاہدوں میں عملی طور پر ایک غیر حاضر رکن کا کردار ادا کرتا ہے۔ اس لئے بڑے بڑے بین الاقوامی مسائل پر نقطۂ نظر میں یکسانیت اور ہم آہنگی کی بنا پر یہی کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی ممالک کے درمیان مشترکہ مفاد

کے لئے بہت حد تک گنجائش موجود ہے۔

عربوں کی نا اتفاقی۔ عرب ملکوں کا داخلی خلفشار اور باہمی بے اتفاقی عالم اسلام کے اتحاد میں بہت بڑی رکاوٹ ثابت ہو سکتی ہے۔ بدقسمتی سے عرب ریاستوں کے اتحاد کی کوششوں پر ان کے دیرینہ اختلافات اور ماضی کی رقابتوں نے ہمیشہ پانی پھیرا ہے۔ یہ ناگزیر تھا کہ اس علاقے سے برطانوی اور فرانسیسی اثر و نفوذ کے خاتمے پر ایک خلا پیدا ہو جاتا۔ جس کے باعث اس قسم کے مسائل جنم لیتے جن سے گزشتہ بیس برس سے پاکستان اور بھارت دوچار ہیں۔ یہ امکان ہے کہ اس خطے میں سیاسی فکر کا ارتقا انھیں مصنوعی حالت سے نکال کر حقیقت پسندی اور عقل و استدلال کی راہ پر لے جائے۔ جتنی رفتار، طاقت اور اثر کے ساتھ یہ لہر رونما ہوگی اس کے مطابق آنے والے دور میں عالم اسلام کے آئندہ واقعات کی راہیں متعین ہوں گی۔ اگر وہ مشترکہ نصب العین پر اکھٹے نہ ہو سکے تو بیرونی ممالک کے اثرات کا دھارا ان ممالک کے تعمیری اور سیاسی ارتقاء کو نقصان پہنچائے گا۔

اس علاقے کی موجودہ صنعتی ترقی جس مرحلے پر ہے اس کا بامر مجبوری ایک تقاضا یہ ہے کہ اسلامی ممالک فوجی ضروریات کے لئے غیر ممالک پر انحصار کریں، اور صرف امریکہ اور روس ہی اتنی طاقت اور

صلاحیت رکھتے ہیں کہ آئندہ پانچ سے دس سال تک وہ ان ملکوں کی ضروریات کو پورا کرتے رہیں۔ اس کے بعد عوامی جمہوریہ چین بھی اس قابل ہو جائے گا کہ ان ملکوں کی ضروریات پوری کر سکے اور جدید ترین اسلحہ مہیا کر سکے۔ جب تک مسلم ممالک بڑی طاقتوں پر انحصار کرتے رہیں گے اور ان کے محتاج رہیں گے اس وقت تک اس خطہ کی مرکز گریز طاقتیں اپنے تمام سیاسی اور اقتصادی مسائل کے حل کے لئے غیروں کی جانب دیکھتی رہیں گی۔

عالم اسلام کی موجودہ صورت حال دفاعی مسائل سے متعلق کسی مؤثر اور متحدہ فوجی نصب العین کی راہ میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔ تاہم اگر سیاسی عوامل کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اس علاقے میں اتحاد کے لوازم موجود ہیں یہ امکان موجود ہے کہ اس خطے کا سیاسی نشو و ارتقا اور بیرونی اثرات مستقبل میں ایسی سازگار فضا پیدا کر دیں۔ جس سے ان کا باہمی اتحاد وجود میں آسکے ان ممالک میں سیاسی اور تعمیری تصورات کا فروغ اسی صورت میں ممکن ہے کہ یہاں کے سیاسی رہنما بصیرت اور دور اندیشی سے کام لیں اور باہمی اتحاد کی اہمیت کا صحیح احساس پیدا کریں۔

پاکستان کے دفاعی مسائل اگر ایک طرف اسے اپنے

ہمسایہ ممالک کی طرف دیکھنے پر آمادہ کرتے ہیں تو دوسری طرف فوری ضرورت کا تقاضا ہے کہ وہ کسی نہ کسی بڑی طاقت کی جانب رجوع کرے۔ فوجی معاہدات کے ضمن میں پاکستان کے تجربات سے جو نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں ان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جنگ کی صورت میں دفاع کے موثر انتظامات کا دارومدار دو بنیادوں پر ہے۔ ان میں پہلی بنیاد تو یہ ہے کہ فوجی امداد کے بارے میں ایک واضح قسم کی سیاسی مفاہمت موجود ہو اور دوسری یہ کہ اس امداد سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کے لئے امن کے زمانے میں مناسب منصوبہ بندی کی گئی ہو۔ اگر ان شرائط کو پورا نہ کیا جائے تو فوجی امداد میسر آنے کے باوجود اس کے فوائد محدود ہو کر رہ جاتے ہیں۔

دنیا کی بڑی طاقتوں کے مفادات انھیں ان جھگڑوں میں ملوث ہونے کی اجازت نہیں دیتے جن میں پاکستان ایک فریق کی حیثیت رکھتا ہو۔ اس لئے یہ لازمی ہے کہ اپنے اہم مفادات کی حفاظت کے لئے پاکستان کو صرف اپنے وسائل پر بھروسہ کرنا چاہئے۔ بدقسمتی سے پاکستان کے وسائل بہت محدود ہیں خاص طور پر جب ان کا بھارت کی افرادی طاقت، صنعتی صلاحیت اور فوجی قوت سے موازنہ کیا جائے تو وسائل کی یہ کمی اور بھی کھٹکنے لگتی ہے۔ مروجہ طریقوں

کے مطابق جنگ لڑی جائے تو اسلحہ اور فوجی سازوسامان اس کے نتائج پر گہرے اثرات ڈالتے ہیں۔ لیکن چھوٹا فریق اگر ایسی جنگی تدابیر اور چال سے کام لے جس سے دشمن اپنی فوجی برتری اور اسلحہ وسامان کی فراوانی سے مکمل فائدہ نہ اٹھا سکے تو جنگ کے نتائج پر اسلحہ کی برتری کے اثرات کم ہو جاتے ہیں۔ ایک کمزور یا چھوٹا ملک اگر قدیم یا مروجہ طریقوں کے مطابق جنگ لڑے تو ابتدا ہی سے اسے نامساعد اور ناموافق حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

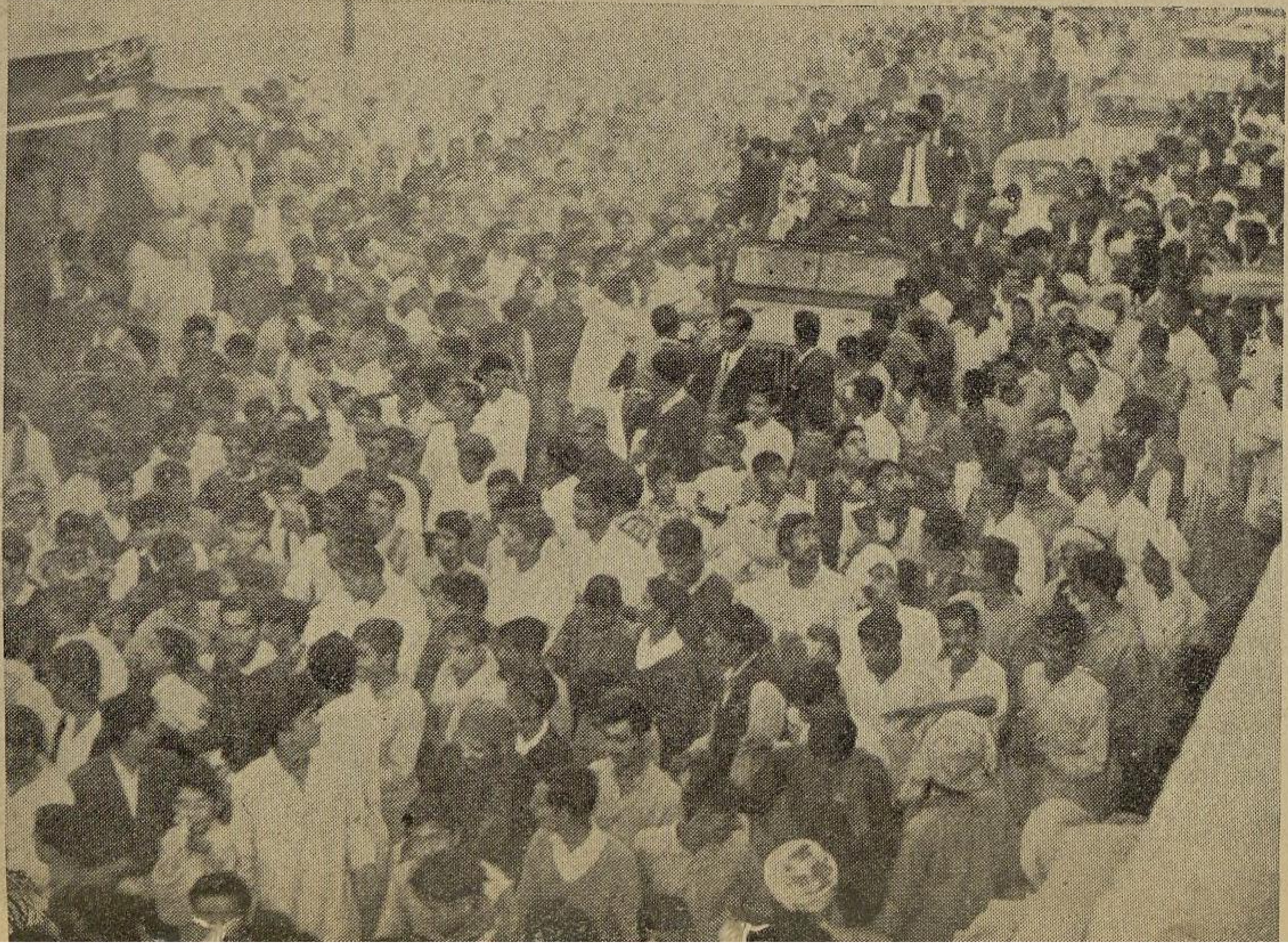
دفاع کا جو نظام ہمیں ورثے میں ملا ہے اس کی جڑیں ماضی کے نوآبادیاتی نظام میں پیوستہ ہیں۔ دفاع کا یہ نظام ایک مغربی طاقت کے ہاتھوں طویل مدت میں غیر ملکی اور مخالف ماحول میں پروان چڑھا۔ اس کی پشت پر لامحدود مادی اور صنعتی وسائل موجود تھے جن کی بدولت ایک مستقل اور باقاعدہ فوج کو بھاری اسلحہ سے لیس کرنا اور اس کی تمام ضروریات پوری کرنا آسان تھا۔ اس کے برعکس پاکستان کے آج کل کے حالات بالکل مختلف ہیں۔ اس لئے عقل مندی کا تقاضا یہی ہے کہ ہم کوئی ایسا طریقہ دفاع اختیار کریں جو ہمارے مخصوص حالات کے عین مطابق ہو اور جس سے ہمیں قطعی فوائد حاصل ہوں۔

پاکستان کی جسامت، وسائل اور سیاسی فلسفہ اس بات کی اجازت

نہیں دیتا کہ وہ اپنے کسی بڑے ہمسائے کے خلاف کوئی جارحانہ کارروائی کر سکے۔ اندیشہ ہے کہ بھارت میں جنگ پسند ہندو سیاسی پارٹیوں کی بڑھتی ہوئی طاقت پاکستان کی بقا کے لیے بہت بڑا خطرہ بن جائے گی۔ بھارت کی بڑھتی ہوئی صنعتی طاقت، اس کی جسامت، رقبہ، اور فوجی وسائل میں بے پناہ اضافہ شاید اس کے کامیابی کے گھمنڈ اور امکانات کو بڑھا دے۔ جس کے سبب وہ ہمارے خلاف کسی جارحانہ فوجی مہم کے لئے آمادہ ہو جائے۔ اس لئے پاکستان کو صرف دشمن کے پہلے وار کا مقابلہ کرنے کے لئے ہی نہیں بلکہ مؤثر جوابی کارروائی کے لئے بھی ہر وقت چوکس اور تیار رہنا چاہیئے۔ اس قسم کی دفاعی جنگ میں جس کا ہم پر مسلط کئے جانے کا غالب امکان ہے مدافعت کرنے والوں کو اپنے علاقے میں لڑنے کی وجہ سے کئی فائدے حاصل ہوتے ہیں اور اس کے برعکس حملہ آوروں کو ان مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو دشمن کے علاقے میں لڑنے کی بنا پر پیدا ہوتے ہیں۔ تاہم اس سے پورا فائدہ اسی صورت میں اٹھایا جا سکتا ہے جب عوام کو جنگ میں شامل ہونے کا موقع فراہم کیا جائے۔ اگر شہری آبادی کو فوجی تربیت نہ دی جائے اور انھیں غیر مسلح چھوڑ دیا جائے تو نہ صرف وہ اپنے وطن کے دفاع میں حصہ

نہیں لے سکتے بلکہ سفت کا دردِ سر بھی بن جاتے ہیں اور باقاعدہ فوج کا کچھ حصّہ صرف ان کی حفاظت کے لئے مخصوص کرنا پڑتا ہے۔

عوامی فوج کی ضرورت۔ جنگ کی صورت میں پاکستان کو اپنی افرادی قوت کا ایک بڑا حصّہ اپنی وسیع اور طویل سرحدوں کی حفاظت کے لئے متعین کرنا پڑے گا۔ تاہم جلد یا بدیر اسے پیش قدمی کی ضرورت پیش آئے گی۔ پھر یہ ضروری ہوگا کہ اس مقصد کے لئے جس علاقے کا انتخاب کیا جائے وہاں اسے تین اور ایک کی نسبت سے وقتی برتری حاصل ہو۔ پیش قدمی کی اس صلاحیت کے بغیر پاکستان کی فوجی حالت شدید کمزور رہے گی اور اس کے وجود اور استحکام کو ہمیشہ خطرہ لاحق رہے گا۔ پاکستان کے دفاع کے لئے پیش قدمی بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ رقبے اور تعداد میں کمی کی وجہ سے ہمارے لئے ضروری ہے کہ جنگ کا استعمال بڑی مہارت اور ذہانت سے کیا جائے نیز پیش قدمی کی تدبیر اس قدر محتاط اور جرأت مندانہ ہو کہ دشمن پوری طرح گرفت میں آجائے۔ اور اس کی طاقت کو مکمل طور پر مفلوج اور ناکارہ کر دیا جائے۔ اس نوعیت کی جنگی تدبیر پہ اگر کامیابی سے عملدرآمد کیا جائے تو رقبے کی کمی کی تلافی کی جا سکتی ہے۔ اور شاید یہی ہماری سب سے بڑی کمزوری ہے۔ تاہم پیش قدمی کی صورت میں یہ ضروری



مظفر گڑھ میں
ایئر مارشل
کے
استقبال کا
ایک منظر

ہے کہ آمدورفت کے لازمی ذرائع، اہم علاقوں، کارخانوں اور منصوبوں کی حفاظت کیلئے بھی مناسب انتظامات موجود ہوں۔ یوں ہمارے یہ تمام صنعتی اور فوجی اہمیت کے مقامات اور ادارے وسیع علاقوں میں بکھرے ہوئے ہیں اور ملک کے دونوں بازوؤں میں ایسی جگہوں پر واقع ہیں جو براہ راست بھارت کی زد میں ہیں۔ موجودہ طریقۂ دفاع کے مطابق بڑی تعداد میں ایک مستقل فوج کی ضرورت پیش آتی ہے۔ جدید فوجی آلات کے علاوہ کافی بڑی باقاعدہ فوج کے قیام کے لئے بھاری اخراجات برداشت کرنا ہماری طاقت سے باہر ہے۔ اس کا تسلی بخش اور واحد حل یہی ہے کہ اس مقصد کے لئے بھاری تعداد میں عوامی فوج تیار کی جائے۔ ابتدائی طور پر ایک سال کی فوجی تربیت اور بعد میں ہر سال قریباً ایک ماہ پر مشتمل ریفریشر کورس کی بدولت قابلِ اطمینان اور معیاری فوج تیار کی جاسکتی ہے اور اس سے مطلوبہ مقاصد حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ موجودہ باقاعدہ افواج پر جس قدر رقم خرچ کی جارہی ہے اس قدر رقم سے کئی گنا بڑی عوامی فوج تیار کی جاسکتی ہے۔ جو ملک کے دفاع میں بہت اہم اور قابلِ قدر کارنامہ انجام دے سکتی ہے۔ اس طرح باقاعدہ فوج ان مسلح فوجی مہمات کے لئے استعمال کی جائے گی جن کے لئے زیادہ مہارت اور خصوصی تربیت

کی ضرورت پیش آتی ہے۔ نقل و حرکت کے لئے ہر وقت مستعد اور تیار باقاعدہ فوج دشمن پر کاری ضرب لگانے کے کام آئے گی جس کے جوابی حملے کے لئے سخت ضرورت ہوتی ہے۔

عوام پر اعتماد۔ ملک کے دفاع کا اس طرز کا نیا ڈھانچہ اُس پرانے دفاعی نظام سے یکسر مختلف ہوگا جس سے ہم آج تک آشنا اور مانوس رہے ہیں۔ شہریوں پر عدم اعتماد اور ان کی جنگی صلاحیت سے انکار اور صرف پیشہ ور سپاہی پر بھروسہ، اپنے اور دشمن کے علاقوں میں لڑنے والی تربیت یافتہ بھاری اور بے پناہ اخراجات کی حامل فوج ہمارے ذہنوں اور خیالوں میں رچ بس گئی ہے۔ فوجی تاریخ کے گہرے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی قوم کے عزم و یقین کو اگر مناسب تربیت دی جائے تو وہ سخت سے سخت مشکلات اور دشوار سے دشوار رکاوٹوں کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ شمالی ویت نام اور اسرائیل اگرچہ مختلف دفاعی نظاموں اور جنگی طریقوں سے وابستہ ہیں لیکن ان کی تازہ مثالیں اس نظریہ کی تصدیق کرتی ہیں کہ قومی وسائل کا مکمل استعمال اور عوام پر مشتمل فوج کی جنگ میں مکمل شرکت فوجی اعتبار سے بڑی اہمیت اور قدر و قیمت کی حامل ہو سکتی ہے۔

پاکستان کا نصب العین اور اس کے سیاسی و نظریاتی مقاصد تقاضا کرتے ہیں کہ وہ نہ صرف اپنے وجود کے تحفظ اور بقا کا یقین دلائے بلکہ عالم اسلام کی سالمیت اور استحکام کے لئے بھی اپنا فرض بطریق انجام دے۔ پاکستان نہ صرف دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت ہے بلکہ یہ اسلام اور صرف اسلام کی بنیاد پر قائم ہوئی۔ اس لئے یہ اٹل حقیقت ہے کہ پاکستان کو اپنے ہمسایہ ممالک کے مسائل میں شریک ہونا پڑے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اسکی دفاعی صلاحیت اور جنگی طاقت ایسی ہونی چاہیئے کہ وہ اس چیلنج کا مقابلہ کر سکے اس کے برعکس کوئی اور موقف اختیار کرنا خود کو مستقل خطرے اور بے یقینی میں مبتلا کر دینے کے برابر ہے۔ اس صورت میں بھارت کی طاقت اور وسائل پاکستان کے وجود کو خطرے میں ڈال دیں گے اور اسلامی ممالک کی صف میں اپنا جائز مقام حاصل کرنے کے راستے میں عظیم رکاوٹ ثابت ہوں گے۔ یہ پاکستان کی بالغ نظری، بصیرت اور جرأت کا ایک ایسا امتحان ہے جسے تاریخ شاید اس کی پیدائش سے بھی زیادہ اہمیت دے۔

اتحاد و یقین کی بنیاد

کشمیر، دفاع، خوراک، پیداوار اور برآمد جیسے وہ تمام مسائل

جو پاکستان کو درپیش ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ اہم اتحاد کا مسئلہ ہے درحقیقت یہ مسئلہ بہت سنگین اور شدید نوعیت کا حامل ہے۔ آزادی کے بعد بیس سال سے ہم دیکھ رہے ہیں کہ جن رشتوں نے ملک کے مختلف علاقوں کے لوگوں کو باہم منسلک کر رکھا تھا وہ روز بروز کمزور ہوتے جا رہے ہیں اور جس جذبے کی بدولت ایک نئی قوم سخت مشکلات کے باوجود آگے بڑھتی رہی وہ اب سرد پڑتا جا رہا ہے۔ اگر اس رجحان پر قابو پانا مقصود ہے تو اتحاد کی کمزوری کے اسباب کو اچھی طرح سمجھنا اور جاننا بڑا ضروری اور اہم ہے۔ ان اسباب کو سمجھنے کے بعد ہی ان رشتوں کو از سرِ نو مضبوط بنانے کے لئے کوئی مؤثر اور سنجیدہ کوشش کی جا سکتی ہے۔ جن کی بدولت ہم ایک قوم بنے تھے۔

تاریخ میں ایسی بہت کم مثالیں ملتی ہیں جب ایک قوم نے ایک آزاد و خود مختار قوم کی حیثیت سے زندہ رہنے کے عزم کا اعلان کرنے کے بعد صرف سات آٹھ سال کی قلیل مدت میں اپنا نصب العین بھی حاصل کر لیا ہو۔ اس ضمن میں اسے ایک طرف وقت کے حکمرانوں کے دانستہ نظریات اور دوسری انتہائی منظم، طاقتور اور متمول اکثریتی طبقے کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا تھا لیکن ان تمام دشواریوں اور سنگین

رکاوٹوں کے باوجود محض عزم و ہمت کی بدولت وہ کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ یہ معجزہ صرف اسی وجہ سے ممکن ہوا کیونکہ لوگوں میں الگ قومیت کا صحیح شعور موجود تھا اور انھیں اعلیٰ درجے کی قیادت میسّر آگئی تھی۔ جس نے ان میں انفرادیت کا احساس اس شدّت سے بیدار کردیا کہ پھر ان کے مطالبے کے سامنے کوئی رکاوٹ اور مزاحمت نہ ٹھہر سکی۔ اس کی اوّلین ضرورت بلند پایہ قیادت تھی۔ اس کے بعد ایک ایسا مشترک رشتہ دوسری ضرورت تھی جس پر اتحاد کی عمارت استوار کی جاسکتی تھی۔ مذہب، مشترکہ تاریخی تجربات اور اقتصادی و معاشرتی مقاصد نے الگ قومیت کے لئے تڑپ اور اُمنگ پیدا کی۔

قیادت تاہم نہ تو خلاء میں قائم رہ سکتی ہے اور نہ یہ پیروکاروں کے نصب العین اور توقعات کو مناسب طور پر پورا کئے بغیر زندہ رہ سکتی ہے۔ نئی مملکت کے وجود میں آنے سے قبل اس کے مذہبی، اقتصادی اور معاشرتی مقاصد اور نصب العین کی واضح نشان دہی نہیں کی گئی تھی اور نہ بعد میں آنے برسرِاقتدار آنے والی حکومتوں نے یہ مناسب اور ضروری سمجھا۔ بار بار دہرائے جانے والے جماعتی منشوروں اور پروگراموں میں "اسلامی ریاست" کے قیام پر بلاشبہ بڑا زور دیا گیا۔ لیکن عملاً یہ وعدے کبھی پورے

نہ ہوئے۔ اس کوتاہی کا باعث کسی حد تک وسائل کی کمی اور دیگر حالات تھے۔ لیکن اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ نصب العین سے وابستگی کا فقدان تھا۔ اور ان توقعات اور مقاصد کو پورا کرنے کے لئے وہ خلوص اور تڑپ ہی سرے سے موجود نہ تھی جن کیلئے ملک وجود میں لایا گیا تھا۔ برسراقتدار سیاسی جماعتوں کی قیادت ان لوگوں کے ہاتھ میں تھی جو اپنے مخصوص مفادات کے غلام تھے اور ایسے منشوروں اور پروگراموں پر عمل کرنے سے گریز کرتے تھے جن سے ان کی ذات کو سیاسی اور اقتصادی لحاظ سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ وہ اتنے بے غرض نہیں تھے کہ قوم کے اجتماعی مفادات کی خاطر اپنے ذاتی مفاد اور اغراض قربان کر دیتے۔ اس قربانی سے بچنے کے لئے اپنے افعال اور اعمال کے لئے عقلی دلائل اور بہانے پیش کئے گئے اور عوام کو ایسی کامیابیوں اور کارناموں کا تاثر دے کر گمراہ کیا گیا جن کا حقیقت سے دور کا تعلق بھی نہ تھا

اسلامی مملکت۔ دین کے معاملات میں اصل حقیقت کی بجائے ظاہری رسومات پر زور دیا گیا۔ جس کا مسئلے کی بنیاد سے کوئی تعلق نہ تھا۔ مذہب کے رسمی پہلوؤں پر زور دے کر "اسلامی مملکت" کا ایک تصور پیش کیا گیا جس سے ہمارے مذہب پسند لیکن سادہ دل عوام بہت

حد تک مطمئن ہو گئے۔ لیکن معاشرتی انصاف اور انسانی وقار جیسے پہلوؤں کی طرف کوئی توجہ نہ کی گئی جو درحقیقت اسلام کے انتہائی اہم اور امتیازی اوصاف ہیں، لہٰذا وہ شرائط پوری نہ ہو سکیں جو اسلامی معاشرے کے لئے بنیادی حیثیت رکھتی ہیں بلکہ امیر اور غریب کے درمیان جو فرق موجود تھا اسے بڑھنے اور پھیلنے کی عام اجازت دے دی گئی۔ وہ لوگ، جو دوسروں کی بہ نسبت پہلے ہی زیادہ خوشحال اور صاحب حیثیت تھے ان کے مال و دولت اور جائداد پر کوئی پابندی نہ لگائی گئی بلکہ اسے مزید بڑھنے دیا گیا۔ اکثر و بیشتر پاکستانیوں کے ذہن میں "اسلامی مملکت" کا جو تصور تھا وہ بالکل پورا نہ ہوا۔ صرف یہی وہ سب سے بڑا اور واحد سبب ہے جس نے بے اطمینانی کی اس عام فضا کو وسیع کرنے میں حصہ لیا جو آج تک موجود ہے۔ اس مایوسی و ناکامی کے باعث برسرِ اقتدار آنے والی حکومتوں پر لوگوں کا اعتماد کم ہو گیا۔ اور انھیں ان حکومتوں کے خلوص اور صلاحیت میں کمی کا احساس ہونے لگا۔ کہ وہ ان سے کئے گئے وعدوں کو عملی جامہ پہنانے کے قابل بھی ہیں؟ چند افراد کی خوش حالی۔ اگر ان حالات میں بھی مختلف علاقوں میں بسنے والے لوگ خوشحالی میں یکساں حصہ دار ہوتے تو شاید بے اطمینانی کا دائرہ اس قدر وسیع نہ ہوتا۔ تاہم یہ ناگزیر تھا کہ اس قسم کے حالات میں سیاسی اقتدا

کاروباری صلاحیت اور معاشرتی اثر و رسوخ کو بے پناہ اہمیت دی جانے لگتی۔ اس لئے عام طور پر ان عوامل کی بدولت لوگوں نے حکومت سے اپنی من مانی شرائط منوائیں بالخصوص جب حکومت کو بعض علاقوں میں کاروباری یا صنعتی منصوبوں کے لئے ان لوگوں کی امداد کی ضرورت پیش آئی۔ خاص طور پر ایک یونٹ کے قیام کے بعد مغربی پاکستان میں بعض علاقوں کی ترقی کی جانب بہت کم توجہ کی گئی کیونکہ بدلے ہوتے سیاسی حالات کے مطابق ان علاقوں کو زیادہ اہمیت حاصل نہ رہی تھی چونکہ یہ دیہی علاقے دور دراز واقع ہونے کی وجہ سے کچھ زیادہ ترقی یافتہ نہ تھے اور سیاسی طور پر کافی بے اثر تھے اس لئے اس پالیسی سے انہیں اور زیادہ نقصان پہنچا۔ مشرقی پاکستان میں ملکی سرمائے میں کمی اور اعلیٰ تعلیمی اداروں کے فقدان نے بھی صوبے کی ترقی میں وہاں کے باشندوں کی شرکت کو محدود کر دیا۔ اس خلا کو مغربی پاکستان کے فنی تجربہ اور سرمائے سے پر کیا گیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس طاقت ور طبقے کی دولت، قوت اور کاروباری صلاحیت میں مزید اضافہ ہوا۔ یہ تجارت اور کاروبار جس پر مغربی پاکستان کے لوگ حاوی تھے جب اس میں وسعت ہوئی تو معاشرے کے مختلف طبقوں کے درمیان امارت کا فرق اور بھی بڑھ گیا۔ اس لئے مشرقی پاکستان میں

یہ سمجھا جانے لگا کہ دولت پر صرف مغربی پاکستانیوں کا قبضہ ہے۔ اس طرح معاشرتی اور اقتصادی شعبوں میں عدم مساوات کا احساس اور زیادہ نمایاں ہو گیا۔

مرکز میں حکومتوں کی متواتر تبدیلی سے سیاسی مشینری کے اثر و اقتدار میں کمی واقع ہوئی۔ اور طاقت زیادہ تر سول حکام کے ہاتھوں میں منتقل ہونے لگی۔ ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۸ء تک دو اعلیٰ سرکاری افسر سربراہ مملکت کے منصب پر فائز ہوئے جن کی بدولت اس رجحان میں اور اضافہ ہو گیا۔ پاکستان کی سول سروس میں زیادہ تر مغربی پاکستان کے لوگ غالب تھے۔ اس لئے بین الصوبائی ہم آہنگی، رواداری اور باہمی اعتماد کی فضا زبردست متاثر ہوئی۔ ان غیر اطمینان بخش حالات میں ۱۹۵۸ء میں ایک اور عنصر شامل ہو گیا۔ آئین کی منسوخی اور مارشل لاء کے نفاذ سے یہ بات اور بھی واضح ہو گئی کہ اصل طاقت مسلح افواج کے ہاتھ میں ہے۔ سول حکام کی طرح مسلح افواج میں بھی مغربی پاکستان کے لوگ اکثریت میں تھے۔ اور جب نئی حکومت نے مضبوطی سے پاؤں جما لئے تو ماؤزے تنگ کے اس مشہور قول کی صداقت ثابت ہو گئی کہ تمام سیاسی طاقت کا سرچشمہ بندوق کی نالی ہے۔

۱۹۴۰ء میں قرار دادِ پاکستان کی منظوری کے بعد جب برصغیر کے

مسلمانوں کے لئے ایک الگ وطن کا مطالبہ سامنے آیا تو قومیت کی تعریف کے بارے میں بحث شروع ہو گئی جو نئی مملکت کے وجود میں آنے پر خود بخود ختم ہو گئی۔ آخر کار یہ ثابت ہو گیا کہ قوم اسے کہتے ہیں جس میں علیحدہ زیست کا احساس موجود ہو۔ پاکستان اس وقت تک قائم رہ سکتا ہے جب تک مختلف عناصر ان رشتوں کو محسوس کرتے رہیں، جنہوں نے انہیں ایک قوم بنایا تھا۔ ان رشتوں کی بنیاد صرف ماضی کی یادوں سے ہی وابستہ نہیں ہوتی بلکہ ان کا دار و مدار مستقبل کی امیدوں اور آرزوؤں پر بھی ہوتا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ یادیں کون سی ہیں جنہوں نے تقریباً ناقابلِ تسخیر مشکلات کے باوجود اس قدر طاقت اور توانائی بخش دی کہ جس سے ایک قوم وجود میں آئی اور وہ امیدیں اور توقعات کون سی تھیں جنہوں نے ایک ایسی قوم کو متحد کر دیا جو نسل اور زبان کے اعتبار سے اتنے مختلف تھے جتنے بنگالی اور پٹھان مختلف ہیں۔

وہ تمام رشتے جن کی بدولت اہلِ پاکستان اتحاد کی لڑی میں باہم منسلک ہیں ان میں سے اہم ترین اسلام کا رشتہ ہے۔ یہ اسلام ہی تھا جس کی بنا پر مختلف نسلوں سے تعلق رکھنے والے اور علیحدہ علیحدہ زبانیں استعمال کرنے والے لوگ ایک قوم بن گئے اور اب بھی وہ طاقت ہے جو ہمارے اتحاد کو زندہ و برقرار رکھ سکتی ہے۔ لیکن یہ اتحاد صرف روحانی یا جذباتی

آرزوؤں کی پیداوار نہ تھا۔ دراصل یہ اتحاد ہند و تہذیب و ثقافت سے صدیوں کے تعلقات کے نتیجے میں پیدا ہؤا تھا۔ جس نے ایک ایسے طرز زندگی کے لئے تڑپ پیدا کر دی جو ہمارے خیالات کا آئینہ دار ہو۔ پاکستان نے اقتصادی اور معاشرتی مواقع کی ترغیب پیدا کی جس سے برصغیر کے مسلمان صدیوں سے ناآشنا تھے۔ اس سے یہ توقع بھی پیدا ہوئی کہ ایک ایسی ریاست وجود میں آئے گی جس کی بنیاد اسلامی قدروں پر رکھی جائے گی۔ ان قدروں میں انسانی وقار، معاشرتی انصاف اور فرد کی آزادی کو اہم اور بلند مقام حاصل ہوگا۔ اس لئے بیس سال کی مدت میں بھی یہ توقعات اور امیدیں پوری نہ ہونے کی وجہ سے ملک میں بے اطمینانی اور مایوسی کی فضا پیدا ہو جانا کوئی تعجب انگیز بات نہیں۔ یہ درست ہے کہ بعض لوگوں کے ذہن میں ایک مثالی ریاست "یوٹوپیا" کا نقشہ جاگزیں تھا جس کی کامیابی محال تھی لیکن ہمارے معاشرے کے اعتدال پسند لوگوں کی امیدیں اور توقعات بھی ادھوری رہیں۔ اگر مواقع میں مساوات، معاشرتی انصاف اور انسانی وقار اسلام کی امتیازی خصوصیات ہیں تو آج ہمارا معاشرہ اس اسلامی رنگ سے بھی دور جا چکا ہے۔ جو بیس سال پہلے موجود تھا۔ معاشرتی امن وامان کے اس فقدان نے عام مایوسی کو جنم دیا ہے جس

کی کروڑوں انسانوں نے تمنا کی تھی۔ دوسرے علاقوں کی بہ نسبت مشرقی پاکستان میں اس کا شدید احساس پایا جاتا ہے۔

اتحاد کے لئے اقدامات۔ بے اطمینانی کی یہ کیفیت صرف اسی صورت میں ختم کی جاسکتی ہے۔ جب اہلِ پاکستان موقع کی نزاکت اور موجودہ صورتِ حال کا سنجیدگی سے جائزہ لیں اور اس کے تدارک کے لئے اپنا اثر و رسوخ اور طاقت استعمال کریں۔ نیز اپنے آپ کو اس طرح منظم کریں کہ قوم کے سامنے ان قدروں کو از سرِ نو زندہ کیا جائے جن کی بنا پر پاکستان معرضِ وجود میں آیا تھا لیکن اُنھیں محض پراپیگنڈے یا نعرہ بازی کے لئے نہیں بلکہ قومی استحکام کے اہم اور ضروری مرحلوں پر سوچے سمجھے اقدامات کے طور پر استعمال کیا جائے۔ سازگار ماحول اور موافق حالات پیدا کرنے کے لئے جس اہم ترین اقدام کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ طاقت کا محور اور مرکز عوام کے ہاتھ منتقل کر دیا جائے۔ صرف اسی صورت میں ہی مشرقی پاکستان کے عوام قومی معاملات میں اپنا اثر استعمال کر سکتے ہیں جو ان کا حق ہے۔ یہی وہ کامیابی ہے جس کی بدولت قومی سالمیت وجود میں آسکتی ہے۔ اس کے بعد ہی وہ ہمارے معاملات میں اپنی طاقت اور اثر و رسوخ استعمال کریں گے اور ملک کے مجموعی مفاد اور سالمیت کے ضمن میں اپنی ذمہ داری کا احساس کریں گے جو اب تک ہمارے وطن کے صرف ایک

حصے سے متعلق مخصوص عناصر کی میراث رہی ہے۔ بے پناہ صنعتی ترقی اور عوامی فلاح و بہبود کے بیشتر اقدامات عوام میں ذمہ داری اور طاقت کے اس احساس کی جگہ نہیں لے سکتے جو صرف صحیح جمہوری نظام سے پیدا ہو سکتا ہے۔

معاشرتی ناہمواری اور مغربی پاکستانیوں کے غلبے نے ہمارے مشرقی پاکستانی بھائیوں کی اکثریت کے ذہنوں پر ایسے گہرے نقوش ڈال دیئے ہیں کہ نیم دلانہ اقدامات سے کامیابی ممکن نہیں۔ ایسے اقدامات جو معاملے کی تہ اور اصل تک نہ پہنچیں، خواہ وہ کتنی ہی اچھی نیت اور نیک ارادے سے کیوں نہ اختیار کئے جائیں ان سے اصل مسئلہ کے حل میں مدد ملنے کا کوئی امکان نہیں۔ صرف یہ کہنا کافی نہیں کہ ہمارے موجودہ طریقہ انتخاب سے ایک جمہوری حکومت قائم ہو سکتی ہے بلکہ ضروری یہ ہے کہ عملی طور پر بھی ایسا ہو ـــــ بڑھتے ہوئے عدم استحکام سے نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ ملک کے لوگوں کے درمیان باہمی نفرت اور بے اعتمادی نے ان بنیادوں ہی کو ہلا کر رکھ دیا ہے جن پر پاکستان کی بنا رکھی گئی تھی۔ باہمی اعتماد کا یہ فقدان ہمیں کہیں اس حد تک اندھا نہ کر دے کہ ہم ملک کے دونوں بازوؤں کے باہمی انحصار اور اس طرح اس مشترکہ میراث سے ہی محروم ہو جائیں جس کی بدولت وطن عزیز قائم ہوا۔ اگر (خدانخواستہ) ایسا ہوا تو ایک خود مختار طاقت کی حیثیت سے پاکستان کے وجود کو شدید خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ عالمی معاملات میں اس کا اثر و رسوخ

کم ہو جائے گا۔ اور ملک کے دونوں بازوؤں کا دفاع اور بھی دشوار ہو جائے گا اس طرح اسلامی اتحاد کے اس تصور کو بھی شدید نقصان پہنچے گا جو ملک کے مختلف لوگوں کو ایک نظریاتی ریاست کی حیثیت سے باہم اکٹھا کرنے میں آج تک ایک نشانِ راہ بنا رہا ہے۔ صحت مند معاشرے کے ارتقاء کی خاطر مطلوبہ ضروری حالات پیدا کرنے کے لئے ہم اپنے اثر و رسوخ کو جس تدبر اور صبر و استقلال کے ساتھ استعمال کریں گے۔ اس کے مطابق آنے والی کئی نسلوں کی فلاح و بہبود اور خوشحالی پر خوشگوار اثرات پڑیں گے۔ اگر ہم پُرامن اور آئینی طریقے استعمال کر کے ایک محدود اعلیٰ طبقے کے ہاتھ سے اقتدار اور طاقت ہر دلعزیز طبقوں تک منتقل کر دیں تاکہ ملک کے مختلف لوگ مساوی طاقت اور مساوی مواقع سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکیں تو یہی وہ صلاحیت ہے جو اس امر کا فیصلہ کرے گی کہ آیا پاکستان ایک مضبوط اور خود مختار ملک کی حیثیت سے زندہ رہ سکتا ہے۔ اتحاد صرف ایمان کے سہارے قائم رہ سکتا ہے۔ مشترکہ میراث پر ایمان، مشترکہ مقاصد اور نصب العین پر ایمان ہمارے عوام کی حب الوطنی اور صحت مند رجحان پر ایمان، ایک طاقتور اور خود مختار ملک کی حیثیت سے زندہ رہنے کے عزم و ارادے پر ایمان۔

نوجوان اور اُن کے مسائل

کسی ترقی پذیر قوم میں ایسی سرگرمیاں بہت کم دیکھنے میں آتی ہیں جو تعلیم کے مقابلہ میں زیادہ توجہ کی مستحق ہوں۔ ہمارے ملک میں بدقسمتی سے تعلیم ہی ایک ایسا شعبہ ہے جسے سب سے زیادہ نظر انداز کیا گیا ہے۔ پاکستان کو آئندہ طویل مدت کے جو اقتصادی یا معاشرتی مسائل درپیش ہوں گے ان کے حل کا زیادہ تر انحصار تعلیم کی ماہئیت پر ہے جو مستقبل میں نوجوانوں کو دی جائے گی۔ لیکن دیگر انتظامی خدمات، تجارت، صنعت، کاشتکاری یا کسی اور قومی سرگرمی کی طرح تعلیم پر بھی معاشرے کے عام رجحان اور حالت کا اثر پڑتا ہے۔ مزید براں یہ ملک کے مروجہ اخلاقی معیاروں سے بھی اثر لیتی ہے۔ کسی ملک کے نوجوانوں کے درجہ علم اور راست بازی و کردار کے معیار پر چار چیزیں گہرا اثر ڈالتی ہیں۔ ان میں اوّلین اور شاید اہم ترین حیثیت ملک میں رائج سیاسی نظام کو حاصل ہے جس کے ذریعے تعلیمی اداروں کے بارے میں حکومت کی پالیسی اور سرکاری ہدایت و رہنمائی کی راہ متعین ہوتی ہے۔

دوسری شے وہ معاشرتی نظام ہے جو کسی قوم کی ثقافتی وراثت

اور سیاسی فلسفے کی پیداوار ہوتا ہے۔ تیسری چیز اساتذہ کی جماعت ہے، اور چوتھا درجہ والدین کو حاصل ہے۔ جو قوم کے نوجوانوں کے رجحان و کردار کو متاثر کرتا ہے۔

یہ دیکھا گیا ہے کہ کوئی حکومت ملک کے تعلیمی نظام کے لئے جو ہدایت یا رہنمائی دینا چاہتی ہے اس میں عام طور پر دو اہم باتوں کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ ان میں سے ایک تو مالی وسائل ہیں اور دوسری سیاسی مصلحت اور قومی ترقی کے دوررس مفادات جنھیں سب سے زیادہ اہمیت اور وقعت دینا چاہیئے انھیں اکثر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ چونکہ سیاسی مصلحت اور دوررس قومی مفادات کے درمیان بالعموم آویزش رہتی ہے اس لئے سیاسی مصلحت زیادہ اہمیت اختیار کر لیتی ہے یہی وجہ ہے کہ قومی مفادات کے لئے جب قدم اٹھائے جاتے ہیں تو ان پر سیاسی مصلحت ہمیشہ سایہ فگن رہتی ہے۔ مختلف ممالک کے مختلف حالات میں ان اقدامات اور تدابیر کی نوعیت بھی بدل گئی ہے۔ ہماری اپنی مثال ہی لے لیجئے۔ پاکستان میں سیاسی مصلحتوں کا تعلیم پر بلاشبہ اثر پڑا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ قابلِ غور بات یہ ہے کہ موجودہ درس گاہوں کو اچھی طرح چلانے کی بجائے نئے تعلیمی ادارے قائم کرنے پر زور دیا جاتا ہے۔ بعض اوقات عوام کے دباؤ کی بدولت اور اکثر

اوقات کامیابیوں اور کارناموں کی فہرست میں" ایک اور کارنامے" کا اضافہ کرنے کے لئے نئے کالج کھول دیئے گئے لیکن پہلے سے موجود اداروں کی ضروریات کو پورا نہ کیا گیا اور نہ ہی یہ جائزہ لینے کی ضرورت محسوس کی گئی کہ ملک کے مختلف شعبوں میں کتنے گریجوایٹس کی ضرورت ہے۔ اسی طرح مقامی حکام کے دباؤ یا لوگوں کے مطالبات کے پیش نظر ہر جماعت میں داخل شدہ طلباء کی تعداد مناسب حدود سے بڑھا دی گئی اس کا ناگزیر نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ہمارے تعلیمی اداروں میں تعلیم کا عام معیار گر گیا ہے۔ اس منفی انداز کی بدولت ہر سال بیشمار "نیم تعلیم یافتہ گریجوایٹس" تیار ہوتے ہیں۔ جو نہ اچھی ملازمت ہی کر پاتے ہیں اور نہ ملک کی ترقی میں کوئی مفید کردار انجام دے سکتے ہیں۔ اس طرح ہمارے تعلیمی شعبے کے لئے مخصوص محدود مالی وسائل غیر ضروری گریجوایٹس تیار کرنے میں ضائع ہو رہے ہیں جن سے ان لوگوں کا عام معیار بھی گرتا جا رہا ہے جو بعد میں ہماری قومی زندگی کے مختلف شعبوں میں جذب ہو جاتے ہیں۔

معاشرہ اور تعلیم ۔ کسی قوم کو معاشرتی اور روحانی خوشحالی دینے والے پر نظام تعلیم کی تیاری میں ان معاشرتی، تاریخی اور مذہبی قوتوں کو پیش نظر رکھنا لازمی ہے جو کسی معاشرے پر بنیادی اثر ڈالتی ہیں۔ ان میں

سے ایک موثر شے زبان ہے یہ حقیقت ہے کہ علم اور قوتِ اظہار کے حاصل کرنے کا بہتر ذریعہ وہ زبان ہے جس سے لوگ بہت زیادہ آشنا اور مانوس ہوتے ہیں۔ اس قدرتی قانون کی خلاف ورزی سے معاشرے کی تعلیمی ترقی کی رفتار میں رکاوٹ پڑ جاتی ہے۔ تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ کسی بھی قوم نے کسی غیر ملکی زبان کو اختیار کر کے ادب اور سائنس میں حقیقی ترقی حاصل کی ہو۔ غیر ملکی یا درآمد شدہ زبان استعمال کرنے والا ابھی تک کوئی ایسا ملک سامنے نہیں آیا ہے جس نے صف اوّل کی طاقتوں میں مقام پایا ہو۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ اگرچہ انگریزی زبان ایک سو سال سے بھی زیادہ مدت سے پاکستان اور بھارت میں استعمال ہوتی رہی ہے لیکن اس کے باوجود ایک آدمی بھی اس سطح تک نہیں پہنچ سکا کہ اس نے اس زبان میں کوئی تخلیقی کارنامہ سرانجام دیا ہو۔ یہ درست ہے کہ اس تیز رفتار ٹیکنالوجی کے دور میں کسی مغربی زبان کے علم سے بعض فائدے حاصل ہوتے ہیں جنہیں نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ لیکن اپنے ملک کی زبان کو قربان کر کے کسی غیر ملکی زبان پر زور دینے اور اصرار کرنے سے نہ صرف لوگوں کی تخلیقی صلاحیتیں تباہ ہو جاتی ہیں بلکہ مسائل کو سمجھنے اور ان کی تہ تک پہنچنے میں ان کی فکر محدود

ہو کر رہ جاتی ہے۔ حالانکہ ان مسائل کو اس زبان میں زیادہ اچھی طرح سمجھایا اور واضح کیا جا سکتا ہے جس کو لوگ سمجھتے اور جانتے ہوں نیز اس سے بہت زیادہ مانوس اور آشنا بھی ہوں۔ آزادی کے بیس سال بعد بھی ہمارے معاشرے میں انگریزی زبان پر اصرار ہماری ذہنی سوجھ بوجھ پر زبردست طمانچہ ہے۔ اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہم ان بنیادی اصولوں کا شعور نہیں رکھتے جو بنی نوع انسان کی ذہنی اور اخلاقی ترقی پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔

کسی قوم کی تعلیمی ترقی میں جس طرح زبان کو بڑی اہمیت حاصل ہے اسی طرح لوگوں کے خیالات اور اعمال، اخلاق اور نظریاتی فلسفے سے بھی متاثر ہوتے ہیں۔ تعلیم اخلاق اور ذہنی ترقی کا ایک فردوی عمل ہے اور اسے صرف ایسے ماحول میں ہی نشو و ارتقاء حاصل ہوتا ہے جہاں اخلاقی معیاروں کی قدر کی جاتی ہو۔ لوگ صرف اسی صورت میں معاشرے کے بہترین اور مفید ارکان بن سکتے ہیں بشرطیکہ اخلاقی معیاروں کی بنیاد ان روحانی اقدار پر ہو جو کسی قوم کے روحانی سرچشمے سے سیراب و فیض یاب ہوں۔ رشوت اور بداخلاقی سے ملوث ماحول اور مادیت کے شکار معاشرے میں برائیوں کے سوا اور کوئی چیز پھل پھول نہیں سکتی۔ اس لئے تعلیم جو انسانی کوشش کے عمدہ اور

نازک ترین پہلوؤں کی نمائندہ ہے۔ ایسے ماحول میں عام طور پر سب
سے پہلے صدمے کا شکار ہوتی ہے۔

اُستاد اور شاگرد۔ یہ ناگزیر ہے کہ معاشرے کا عام رنگ جس
میں اساتذہ بھی شریک ہوتے ہیں۔ نوجوانوں کی سوچ بچار اور طبیعت
کے میلان پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ہم دنیا کے ان ممالک میں سے
ایک ہیں جن کا تعلیمی بجٹ سب سے کم ہوتا ہے اور محدود وسائل
کے استعمال میں بھی ہم نااہلیت برتتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے
کہ ہمارے بیشتر استادوں کی تنخواہیں ہمارے گھریلو ملازموں سے
کچھ زیادہ نہیں ہوتیں اس کے باوجود اس پیشے کو اختیار کرنے والے
لوگ ذہانت اور قابلیت کے اعتبار سے اس معیار سے بہت بڑھ کر
ہوتے ہیں جس کی ہم ان حالات میں توقع رکھنے میں حق بجانب ہیں۔
کام کے لئے غیر تسلی بخش حالات تنخواہوں کا معمولی سکیل معاشرتی اخلاق
کی پستی اور سرکاری سطح پر قابل تقلید مثالوں کے فقدان نے ملک کے
طلباء پر اساتذہ کے اثر و رسوخ کو کم کرنے میں گہرا حصّہ لیا ہے اور
اس طرح ان کی حیثیت غیر مؤثر ہو کر رہ گئی ہے۔

اساتذہ کے مقابلہ میں اولاد پر والدین زیادہ اہم اور گہرا اثر ڈالتے
ہیں۔ لیکن وہ خود بھی معاشرتی اثرات اور سیاسی و اقتصادی قوتوں کے

پابند ہوتے ہیں۔ اگر کسی معاشرے میں رشوت ستانی اور دیگر معاشرتی بدعنوانیاں عام ہوں تو وہ ہمارے گھروں کے ماحول پر اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتیں اس لئے ہمارے نوجوان ان غیر صحت مند اثرات سے بھلا کس طرح بچ سکتے ہیں، جن سے انھیں عمر کے آغاز کے ساتھ ساتھ ہی واسطہ پڑنے لگتا ہے۔ اسلام کے بلند پایہ اخلاقی اصولوں اور ہمارے معاشرے کی پست اخلاقی مثالوں کے درمیان تضاد کی وجہ سے ان کے ذہنوں میں کشمکش پیدا ہو جاتی ہے جس کے انتہائی ناپسندیدہ اور خطرناک نتائج نکلتے ہیں۔ ان حالات میں علم کے معنی ہی فوت ہو کر رہ جاتے ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ آئندہ نسلوں کو اس کا زبردست خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔

نوجوان طبقہ اور مستقبل۔ یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ ماحول سے الگ تھلگ رہ کر تعلیم کو فروغ حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہ کسی نظام کا ایک حصہ ہوتی ہے اور مخصوص نظام کی پیدا کردہ فضا کے مطابق یا تو اسے فروغ نصیب ہوگا یا پھر برعکس حالات میں افسردہ و مردہ ہو جائے گی۔ بنیادی اسباب کا علاج کئے بغیر نہ دولت کے انبار اور نہ بے پناہ جد و جہد ہی صورت حال کو بدل سکتی ہے۔ ان حالات ہی تعلیم کے مسئلے کا مطالعہ کرنے کے لئے مقرر ہونے والے تمام کمیشن

اور کمیٹیاں صرف ایسی توقعات کو ہی جنم دے سکتی ہیں جن کے پورا ہونے کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں۔ اہلِ پاکستان کے ایک ترقی پسند اور طاقتور قوم کی حیثیت حاصل کرنے کا انحصار زیادہ تر اس طرزِ تعلیم پر ہے جو نوجوانوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے کے لئے اختیار کیا جاتا ہے اس کا دار و مدار اس اخلاقی و معاشرتی فضا پر ہے جو ہمارے ملک میں اس وقت موجود ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ صحیح اور موزوں ماحول پیدا کرنے کے لئے ہماری اہلیت اس طریقے پر اثر انداز ہوگی جس کے مطابق ہماری نوجوان نسل کو پروان چڑھایا جائے گا۔ درحقیقت ہماری قوم کا مستقبل نوجوانوں کی تربیت اور طرزِ زندگی پر منحصر ہے۔

بےچینی کی جس لہر نے ملک کے نوجوانوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اس کے اسباب قابلِ فہم ہیں اور ان کا تجزیہ ایک دلچسپ اور مفید مطالعہ ہے۔ یہ اسباب دوسرے ملکوں کو درپیش مسائل سے کافی ملتے جلتے ہیں اور اس حد تک موجودہ بے چینی کو اس لہر کا ایک حصہ قرار دیا جا سکتا ہے جس نے ساری دنیا کے نوجوانوں کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ لیکن ہر ملک کے مخصوص حالات، ثقافتی اور مذہبی بنیادیں، مخصوص جغرافیائی حیثیت اور تاریخی روایات و تجربات نوجوانوں کے کردار و اعمال پر اثر ڈالتے ہیں۔ اگرچہ بیشتر عوامل مشترک ہیں

لیکن مختلف حالات میں ان کی اہمیت بدلتی رہتی ہے۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ بنیادی اسباب تو یکساں ہوتے ہیں لیکن مختلف ثقافتی حالات میں ان کا اظہار عموماً مختلف طریقوں پر ہوتا ہے۔ ان سب میں ایک چیز مشترک ہے اور وہ ہے اختیار و اقتدار کے خلاف سرکشی و نافرمانی کا طرزِ عمل۔

نوجوانوں میں سرکشی کا اظہار ایک فطری بات ہے لیکن اس کے اظہار کے ایک سے زیادہ طریقے ہیں، خواہ انوکھے اور نئی طرز کے کپڑے پہنے جائیں خواہ لمبے لمبے بال رکھ لئے جائیں یا کوئی اور قابلِ اعتراض صورت اختیار کی جاتی بنیادی طور پر اظہار کے یہ تمام طریقے ایک ہی تڑپ اور ایک ہی جذبے کی پیداوار ہیں۔ قدامت پسندی سے بیگانگی، آزاد خیالی اور دوسروں کی توجہ حاصل کرنے کی خواہش نیز باعثِ کشش بننے کی آرزو جیسی تمام عادات ہماری طبیعت میں رچی بسی ہیں۔ کوئی معاشرہ جتنا زیادہ سخت گیر جامد اور بے لچک ہوگا اور اس کی گرفت جتنی زیادہ خیال اور تصور سے بعید ہوگی اسی نسبت سے افراد میں اظہار کے طریقوں میں شدت اور سختی نمایاں ہوگی۔

اہلِ اختیار کے خلاف سرکشی سے ذہن میں ایک ایسا طرزِ عمل جنم لیتا ہے جس میں روایات کو ترک کرنے کا رجحان اور نیا طرزِ زندگی اختیار کرنے کا رجحان شامل ہوتا ہے۔ خواہ زندگی کے بارے میں یہ

نظریہ ہمیشہ حقیقت پر مبنی نہ بھی ہو۔ پرانے رسم و رواج اور دستور سے بیگانگی اور جدت پسندی میں آئیڈیل ازم اور تصوریت نے گہرا حصہ لیا ہے۔ نوجوانوں کا ذہن قدرتی طور پر عمل و تجربے سے خالی ہوتا ہے اور اس حد تک وہ ان روایات و رسومات کا نہ عادی ہوتا ہے اور نہ ان سے کوئی اثر لیتا ہے جو اس کے بزرگوں کے لئے بڑی اہمیت اور وقعت رکھتی ہیں۔ اس کے اعمال ابھی دنیاوی ذمہ داریوں، مالی مشکلات اور اقتصادی تحفظ سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ خیال اور تصور کی دنیا ان کے نظریہ زندگی پر حاوی ہوتی ہے۔

یہ رجحان مفید اور بہتر ہے اور درحقیقت ہونا بھی یہی چاہیئے۔ کیونکہ ہماری قومی زندگی کے لئے آئیڈیل ازم بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا روزمرہ کے مسائل کے لئے خالصتہً پرانے اور روایتی طریقۂ زندگی کی ضرورت ہے۔ ایک کے بغیر دوسری شے سے زندگی غیر متوازن ہو جاتی ہے لیکن دونوں کے مناسب اور صحیح امتزاج سے قومیں عروج حاصل کرتی ہیں۔

نوجوان اور معاشرہ ۔ ایک آئیڈیل معاشرے سے معاشرتی سکون جتنا دور ہوگا اسی تناسب سے نوجوانوں میں مایوسی پھیلے گی۔ چونکہ تعلیم انسانی قدروں پر زور دیتی ہے اس لئے ہماری روزمرہ کی زندگی میں ان قدروں کی غیر موجودگی سے ناگزیر طور پر ناموافق ردِ عمل پیدا ہوگا۔ اساتذہ اور قیادت

کی اہلیت و قابلیت کا ملک کے نوجوانوں پر بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔ لیکن استاد بھی معاشرے سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ان کی رہنمائی اور تعلیم میں اسی صورت قوت اور توانائی پیدا ہو سکتی ہے جب معاشرتی ڈھانچے میں وہی انسانی اوصاف جلوہ گر ہوں جن پر اساتذہ زور دیتے ہیں۔ بنیادی انسانی صفات اور معاشرے کی عملی مثالوں کے درمیان تضاد اور اختلاف جتنا زیادہ ہوگا اسی حساب سے ان اصولوں کی افادیت اور اثر انگیزی کم ہو جائے گی جو تعلیمی اداروں میں نوجوانوں کو پڑھائے اور سکھائے جاتے ہیں۔

مذہب ان قوتوں میں سے ایک ہے جس کا معاشرے پر دیرپا اور بڑا گہرا اثر ہوتا ہے۔ ہر مذہب کی بنیاد چند اصولوں پر قائم ہوتی ہے جو بنیادی طور پر باقاعدہ اور باہم مربوط ہوتے ہیں اور ان سے ایک ایسا ڈھانچہ وجود میں آتا ہے جس کے اندر رہ کر معاشرہ کام کر سکتا ہے۔ یہ اصول جتنے سادہ اور آسان ہوں گے، ان کا اثر اتنا ہی زیادہ ہوگا۔ لیکن صرف سادگی ہی وہ محرک نہیں جس نے لوگوں کو اخلاق و کردار کے بلند معیاروں تک پہنچایا ہو۔ کسی مذہب کی پائداری کا امتحان ہمیشہ اس بات سے کیا جاتا ہے کہ اس کی تعلیمات عملی معیار پر کس حد تک پوری اترتی ہیں۔ نظریئے اور عمل کے درمیان جتنا خلا ہوگا اسی کے مطابق اس مذہب کا اثر کمتر ہو جاتا ہے۔

نوجوانوں کا متجسس ذہن اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ مذہب کی تعلیمات

نہ صرف عام فہم ہوں بلکہ روز مرہ کی زندگی اور تجربات میں ان کا عکس جھلکتا نظر آئے۔ اپنی زندگی میں مذہب کی عملی مثالوں کی عدم موجودگی سے ان کے ذہنوں میں یہ شبہات پیدا ہونے لگتے ہیں کہ آیا مذہب روز مرہ کی زندگی میں قابلِ عمل ہے یا نہیں ؟

انسانی ذہن سے زیادہ فعال اور سرگرم کوئی شے نہیں اور نوجوانوں کے ذہن کے بارے میں یہ بات اور بھی زیادہ درست ہے سکول یا کالج کے اوقات ختم ہو جانے کے بعد سوچ بچار کا عمل رُک نہیں جاتا حقیقت یہ ہے کہ ذہنی نقطۂ نظر سے وہ اوقات زیادہ زرخیز اور بار آور ہوتے ہیں جو سکول سے باہر صرف کئے جاتے ہیں۔ جس وقت ذہن سکول کے تنگ لباس کو اُتار پھینکتا ہے تو یہی وہ وقت ہوتا ہے جب ذہن نئی اور دلچسپ راہوں پر چلنا اور سوچنا شروع کرتا ہے۔ یہ پسندیدہ بات ہے کہ ان اوقات میں ذہن کا رُخ ان صحت مند مشاغل کی طرف موڑ دیا جائے جن میں کامیابی کی صورت میں انھیں اطمینان نصیب ہو۔ یہی وہ اہم میدان ہے جس میں در حقیقت نوجوانوں کو موقع فراہم کرنے کے لئے کچھ بھی نہیں کیا گیا۔ اس کے بغیر صرف ایسے نتائج پیدا ہو سکتے ہیں جنھیں کسی طرح بھی پسندیدہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

نوجوانوں میں مقابلے کی امنگ کو مطمئن کرنے کے لئے آسان ترین اور شاید اہم ترین طریقہ یہی ہے کہ کھیلوں میں شرکت کے لئے ان کی حوصلہ

افزائی کی جائے۔ کھیلوں میں حصہ لینے سے جماعت کے ساتھ کام کرنے کا سلیقہ آتا ہے اور اسی سے ذمہ داری کا احساس جنم لیتا ہے اس طرح وہ عملی اور خوشگوار طریقے اور ان تجربات سے آشنا ہوتے ہیں جو آگے چل کر زندگی میں ان کی رہنمائی کرتے ہیں۔ مثلاً کھیل کے میدان میں وہ کامیابی اور ناکامی؛ صبر و استقلال اور سستی و غفلت، جرأت اور بزدلی، اولوالعزمی اور تنگدلی جیسے تجربات حاصل کرتے ہیں۔ یہ بہت دردناک حقیقت ہے کہ ایسے ملک میں جہاں زمین بافراط موجود ہے وہاں کے اکثر و بیشتر سکول اور کالج کھیل کے میدانوں اور دیگر تفریحی سہولتوں سے محروم ہیں۔ کھیل کے میدانوں اور دوسری تفریحی سہولتوں کے اخراجات ہماری مالی حیثیت سے باہر نہیں تاہم ہمارے لیڈروں نے اس کی اہمیت کی جانب کوئی دھیان نہیں دیا۔ کم از کم یہی کہا جا سکتا ہے کہ نوجوانوں کے مسائل کے متعلق ہمارے لیڈروں کا اندازِ فکر سطحی قسم کا رہا ہے تخلیقی اور جمالی قدریں۔ جس طرح کھیلوں سے ہمارے نوجوانوں کے نقطۂ نظر میں وسعت اور ترقی پیدا ہوتی ہے اس طرح ان تخلیقی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی سے مفید نتائج برآمد ہوتے ہیں جن سے ان کی تخلیقی اُمنگ کو اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ ڈرامے، موسیقی اور آرٹ سے ان مخفی صلاحیتوں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے جو ہر انسان میں موجود ہیں اور اپنے اظہار کا تقاضا کرتی ہیں۔ ان کی تکمیل سے نہ صرف اطمینان نصیب ہوتا ہے بلکہ ان خواہشات کو بڑی حد

تک سکون بھی مل جاتا ہے اور اگر یہ کسی طرح پوری نہ ہو سکیں تو لازمی طور پر وہ اپنے اظہار کی دوسری راہیں تلاش کرتی ہیں۔ عجائب گھر اور لائبریریوں سے بھی ذہنی اطمینان ملتا ہے۔ اور انسان کی وہ جمالیاتی ضروریات پوری ہوتی ہیں جو ہر حال اپنی تکمیل چاہتی ہیں۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ ہماری زندگی کے اس شعبے کو بھی بری طرح نظر انداز کیا گیا ہے۔ بدقسمتی سے ایسے اداروں کی قدر و قیمت سے بے خبری اور بے توجہی کی مثالیں عام ہیں + ان سرگرمیوں میں ایک طویل فہرست کا اضافہ کیا جا سکتا ہے جن پر بہت معمولی یا بالکل کچھ بھی خرچ نہ کر کے ہمارے نوجوانوں کی تخلیقی امنگوں کی تکمیل کے لئے راستہ تلاش کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ محض مالیات کی فراہمی کا مسئلہ نہیں بلکہ اس کے لئے جس شے کی ضرورت ہے وہ حکومت کے اعلیٰ حلقوں میں شاذ و نادر موجود ہے اور وہ ہے سمجھ بوجھ اور شعور۔ ہمارے بہت سے مسائل کا حل اس قابلیت اور اہلیت میں پوشیدہ ہے کہ خوشامد اور غلامانہ ذہنیت کو ترک کر کے حکومت کو دیانتداری سے مشورہ دیا جائے۔ لیکن جس نظام میں سچائی کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے، انسانی آزادی کو کچلا جائے اور انسانی وقار کی کوئی قدر نہ کی جائے وہاں عام طور پر دیانت اور بلند خیالی جیسی صفات موجود نہیں ہو سکتیں — پاکستان کے نوجوانوں کے مسائل درحقیقت ہمارے معاشرے کے مسائل ہیں اور یہ اسی صورت میں حل کئے جا سکتے ہیں کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں ملک کی باگ ڈور ہے وہ بلند مقاصد اور نصب العین کے سچے نمائندے ہوں +

عوامی تاثرات

"ایئر مارشل محمد اصغر خان نے جس طرح انتھک جدوجہد کر کے پاک فضائیہ کو اس قابل بنایا کہ اس نے ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں ہمارے بھارتی حکمرانوں کے دلوں میں دہشت پیدا کر کے ملک کی بے پناہ خدمت کی اسی طرح اب انہیں دن رات کام کر کے جمہوریت کے کیمپ کو مضبوط بنایا جانا چاہیئے" ——————

پاکستان ٹائمز مجریہ اسلام ہے۔ ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل کے پرسکون ماحول میں ایک پر ہجوم پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے ایئر مارشل نے سیاست میں عملی حصہ لینے کے متعلق جو اعلان کیا تھا وہ بمشکل دو تین اخبارات میں شائع ہو سکا، ان میں سے ایک اخبار نے تو مکمل اعلان اور روداد شائع کی جبکہ دو اخبارات نے بمشکل پندرہ سطروں میں غیر نمایاں طور پر یہ خبر شائع کی علاوہ ازیں اسی روز ٹرسٹ کے اخبارات میں درجہ چہارم کے ایک نام نہاد "لیڈر" کا بیان نمایاں طور پر بالتصویر شائع کیا گیا تھا۔ جس اخبار میں پریس کانفرنس کی مکمل روداد شائع ہوئی تھی اسے لوگوں نے دو دو روپے میں بھی خریدا اور وہ ذوق شوق سے اس روداد کی ایک ایک سطر پڑھتے رہے اور اپنے دلوں میں امید و عمل کی قندیل روشن کرتے رہے۔ یہ تھا عوامی ردِ عمل۔

اگلے روز وہ ہائیکورٹ بار ایسوسی ایشن کی دعوت پر تقریر کرنے لگے تو ایک زبردست ہجوم نے ان کا پرجوش تالیوں سے خیر مقدم کیا اور ان کی تقریر کا ایک ایک لفظ بڑے غور سے سنا۔ پھر جب وہ لاہور سے راولپنڈی گئے ایبٹ آباد تشریف لے گئے اور پھر نوشہرہ، پشاور، مردان اور جہاں جہاں بھی گئے عوام نے ان کا والہانہ خیر مقدم کیا۔ اسے بھی آپ عوامی ردِ عمل ہی کہہ لیجئے —— ! اخبارات میں تحریکِ جمہوریت پاکستان

سے وابستہ اکثر سیاسی رہنماؤں نے عملی سیاست میں ایئر مارشل کی شمولیت کا خیر مقدم کیا ہے اور خود ایئر مارشل نے راولپنڈی اور ایبٹ آباد میں برملا اعتراف کیا ہے کہ عوام نے جس خلوص اور گرمجوشی سے انھیں کی سیاسیات میں خوش آمدید کہی ہے انھیں اس کی توقع نہیں تھی۔ مغربی پاکستان ہی میں نہیں بلکہ مشرقی پاکستان نے بھی پاکستان کے اس مایہ ناز سپاہی کے لئے دیدہ و دل فرشِ راہ کر دئیے ہیں چنانچہ تحریک جمہوریت پاکستان کے سیکرٹری جنرل جناب محمود علی نے اسے ایک بہتر اقدام قرار دیا ہے۔

اہمیت کیوں ہے؟ بجا طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ائیر مارشل اصغر خاں کو اتنی اہمیت کیوں حاصل ہوئی ہے؟ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ایک سچے کھرے اور مخلص مسلمان کی حیثیت سے ائیر مارشل کسی غیر ملکی ازم کا پرچم اٹھا کر نہیں بلکہ صاف صاف الفاظ میں "پاکستان ازم" کا نصب العین لے کر میدان سیاست میں داخل ہوئے ہیں اور اس "پاکستان ازم" کی انھوں نے ایک ہی تشریح کی ہے کہ یہ اسلام ہے۔

اس ایک بنیادی وجہ کے علاوہ چند چیزیں اور بھی ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ایئر مارشل کا کردار اتنا صاف اور بے داغ ہے کہ نہ صرف یہ کہ تمام لوگ ان کا احترام کرتے ہیں بلکہ "خواص" بھی ان کا احترام کرنے پر مجبور ہیں۔ دوسری وجہ ان کی سیاسی بصیرت ہے۔ وہ ملک کے مسائل کو ملک کے اندر ہی قانونی ذرائع سے مسلمان عوام کے نقطۂ نگاہ کے مطابق حل کرنے کے پرزور حامی ہیں۔ وہ اب تک جن مسائل کے بارے میں اپنا نقطۂ نگاہ بیان کر چکے ہیں ان میں سے چند ذیل میں درج ہیں۔

• طرزِ حکومت • مسئلہ کشمیر • خارجہ پالیسی — اگرچہ تادم تحریر انھوں نے آئینِ ۱۹۶۲ء کے متعلق اپنی تفصیلی رائے ظاہر نہیں کی ہے لیکن اس موضوع پر بھی ان

کا ایک معنی خیز جملہ بڑی شجاعت کے ساتھ سامنے آچکا ہے۔ ائیر مارشل نے لاہور میں بار ایسوسی ایشن سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ " خود برسر اقتدار طبقہ نے اپنے بنائے ہوئے آئین کی خلاف ورزی کی ہے۔" اس ضمن میں آپ نے صدرِ مملکت کی علالت کے دوران میں حکومتی طریق کار کی مثال دی کیونکہ آئین میں صاف طور پر درج ہے کہ صدر مملکت کی علالت کی صورت میں قائم مقام صدر ملک کی صدارت کے فرائض انجام دیں گے، وغیرہ وغیرہ — ائیر مارشل اصغر خاں نے اس طرح بالواسطہ طور پہ یہ بتلا دیا ہے کہ خود برسر اقتدار طبقہ کی نگاہ میں بھی ان کا بنایا ہوا آئین قابل احترام نہیں۔ آپ نے موجودہ حکومتی نظام کو ظالمانہ نظام قرار دیتے ہوئے عوام سے یہ اپیل بھی کی کہ وہ اس کو بدلنے کے لئے متحد ہو جائیں۔ ظاہر ہے کہ یہ مقصد محض افراد کی تبدیلی سے نہیں بلکہ پورے نظام کی تبدیلی سے حاصل ہو سکتا ہے ورنہ جہاں تک افراد کا تعلق ہے گزشتہ دس سال میں ان گنت افراد بدل چکے ہیں۔ اس ضمن میں ائیر مارشل اصغر خاں نے ایک اور نکتے کی بات یہ بھی کہی ہے کہ حکومت کو مسلمہ جمہوری اور آئینی اصولوں کے تحت تبدیل کیا جائے۔ "فوجی" انقلاب بہرحال ملک کے لئے انتہائی خطرناک ہوگا۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ اگر تمام سیاسی جماعتوں نے متحدہ طور پر کام کیا تو فوج کو مداخلت کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی — ● پاک فضائیہ اور پی آئی اے کے سابق سربراہ نے مسئلہ کشمیر کے بارے میں دو ٹوک بات کہی ہے کہ — موجودہ حکومت مسئلہ کشمیر حل کرنے کے لئے سنجیدہ نہیں اس نے یہ مسئلہ سرد خانے میں ڈال دیا ہے اور دوسری بات آپ نے یہ کہی ہے کہ آزاد کشمیر میں جمہوری حکومت قائم کی جائے۔ کیونکہ اسی طرح مقبوضہ علاقے کے عوام میں آزادی کے لئے بے پناہ جذبہ بیدار ہو سکتا ہے۔ آپ کا یہ اعلان اس لحاظ سے انتہائی اہم ہے

کہ ان دنوں آزاد کشمیر میں برسرِ اقتدار طبقہ اپنے بعض ناقابلِ فہم منصوبوں پر عملدرآمد کے لئے "نوکرشاہی" کو مسلط کر رہا ہے۔ اس سلسلے میں آزاد حکومت کے تین سابق صدر سردار محمد ابراہیم خاں، جناب کے ایچ خورشید اور مجاہد اوّل سردار عبد القیوم نے لاہور کی ایک پریس کانفرنس میں اس مسئلہ پر بڑی وضاحت سے روشنی ڈالی ہے۔ افسوس کہ اس کانفرنس کی مکمل روداد اخبارات میں شائع نہیں ہوئی میں اس کانفرنس میں موجود تھا اور ایک محتاط جملے میں یہی اشارہ کر سکتا ہوں کہ جو کچھ ان معزز کشمیری رہنماؤں نے بیان فرمایا ہے اگر اس کا ایک فیصد بھی درست ہے تو ائیر مارشل اصغر خاں کا یہ ارشاد ایک ہزار فیصد درست ہے کہ موجودہ حکومت نے مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کی بجائے اسے سرد خانے کے حوالے کر دیا ہے (بشکریہ آئین لاہور)

● ائیر مارشل اصغر خاں کی آمد سے سیاست میں جو گہما گہمی ہوئی ہے وہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ ملک میں موزوں عزت و توقیر اور ذہنی و اخلاقی بلندی کی حامل کوئی شخصیت موجود نہیں ہے موجودہ حکومت نے پرانے سیاسی رہنماؤں کی عزت و توقیر ختم کرنے کیلئے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی گزشتہ دس سال کے خلاء نے بھی نوجوان، اہل اور قابل افراد کو میدانِ سیاست میں قدم رکھنے سے روکے رکھا ہے۔ ائیر مارشل اصغر خاں کم از کم اس قدر شہرت کے حامل تو ہیں کہ آپ پاک فضائیہ کے پہلے سربراہ تھے اور آپ کی قیادت میں فضائیہ ستمبر ۶۵ء کی آزمائش میں پوری اتری۔ اس کے علاوہ آپ سراپا انتہائی شریف آدمی ہیں اور فریب و مکاری کے الزام سے قطعی مبرا رہے ہیں۔ اور نہ ہی آپ کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ آزمائش کے وقت میں آپ نے اپنے فرائض انجام دینے سے گریز کیا ہے۔ — — — — — — "

(بشکریہ نوائے وقت" لاہور)